یکم اکتوبر ۲۰۲۲ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۵ ۔ شمارہ نمبر: ۱۹

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

اسرائیل میں یہودیوں اور مسلمان عربوں کی شرح پیدائش

اسرائیل میں یہودیوں اور مسلمان عربوں کی شرح پیدائش کی صورت حال تبدیل ہو رہی ہے۔

ایک مشہور اسرائیلی ماہرِ شماریاتِ آبادی (demographer) کا کہنا ہے کہ اگر کسی اسرائیلی خاتون کے تین سے کم بچے ہوں تو اسے سب کے سامنے نہ صرف معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنا پڑتا ہے بلکہ اسے اپنے کم بچوں سے متعلق کئی کئی وضاحتیں بھی دینی پڑتی ہیں۔ برطانیہ اور فرانس جیسے مال دار ممالک کے مقابلے میں اسرائیل میں فی خاندان بچوں کی تعداد زیادہ ہے یعنی ۲٫۹ ہے جب کہ برطانیہ اور فرانس میں بالترتیب ۱٫۶ اور ۱٫۸ ہے۔

اسرائیل میں آبادی کی صورت حال میں سیاسی اور اقتصادی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ اسرائیل کی ۹٫۵ ملین کی آبادی میں ۱۲ فیصد اسرائیلی عرب بھی شامل ہیں جو مسلمان ہیں، جب کہ یہودیوں کی تعداد تقریباً ۷۴ فیصد ہے۔ اگر اسرائیل کے زیر قبضہ مغربی کنارے پر موجود آبادی اور غزہ کے لوگوں کو شامل کریں تو اس کے بعد یہودیوں کی اکثریت کم و بیش نصف رہ جاتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اسرائیل کے لیے یہ سہ شاخہ مسئلہ (trilemma) ہے یعنی اول اسرائیل کے پاس یہاں یہودیوں کی مضبوط اکثریت ہے، دوم اسرائیل کا وہ علاقہ جو اس نے ۱۹۶۷ء میں فتح کیا اور سوم یہ کہ یہاں ایسی جمہوریت نہیں ہو سکتی کہ جو عربوں سے غیر امتیازی سلوک کرے۔ اس صورت حال میں عددی برتری کی اہمیت ہے۔ اسرائیل اور فلسطین کے راہ نما طویل عرصے سے شرح پیدائش پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

ساڑھے تین دہائیوں تک فلسطینیوں کی قیادت پر مامور رہنے والے یاسر عرفات نے عرب عورتوں میں شرح پیدائش کو اپنے لیے ساز گار محسوس کیا۔ آبادیاتی تخمینے یہ ظاہر کرتے تھے کہ دریائے اردن اور بحیرۂ روم کے درمیان مقیم عربوں کی تعداد بالآخر یہودیوں سے بڑھ جائے گی۔ بنیامین نیتن یاہو کو اسرائیل کے سب سے طویل عرصے تک رہنے والے وزیر اعظم بننے سے پہلے اس صورت حال نے یقینی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ اسرائیلی عربوں کی شرح پیدائش اسرائیل کی یہودیت کے لیے خطرہ ہے۔ اس صورت حال میں مغربی کنارے پر موجود عرب آبادی اور غزہ کی عرب آبادی شامل نہیں۔

اس وقت آبادی میں ایک بڑا فرق تھا، یعنی اسرائیل میں مقیم عرب خواتین یہودی عورتوں کے مقابلے میں اوسطاً دوگنا بچے زیادہ پیدا کر رہی تھیں لیکن گزشتہ چند دہائیوں میں یہ فرق ختم ہو گیا ہے کیونکہ اسرائیل میں موجود عربوں کے یہاں شرح پیدائش میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کے برعکس اسرائیلی یہودیوں کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۶۰ء میں اسرائیلی عربوں کی یہاں شرح پیدائش ۹٫۳ تھی۔ اگلے ۵۳ برسوں میں یہ شرح کم ہو کر تقریباً نصف یعنی ۴٫۷ رہ جاتی ہے۔ غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینیوں کی شرح پیدائش بھی ۲۰۰۳ء میں ۶٫۴ سے کم ہو کر ۲۰۱۹ء میں ۳٫۸ رہ گئی ہے۔ آرگنائزیشن فور اکنامک کوآپریشن اینڈ ڈیولپمنٹ (Organization for Economic Cooperation and Development) میں زیادہ تر امیر ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک میں بھی شرح پیدائش کم ہوئی ہے۔ ان ممالک میں ۱۹۷۰ء میں شرح پیدائش تین تھی جو کم ہو کر ۱٫۶ رہ گئی ہے۔ آبادی کو سکڑنے جیسے خطرات سے بچانے کے لیے جو شرح پیدائش درکار ہے وہ ۲٫۱ ہے۔

پیو ریسرچ سینٹر (Pew Research Centre) کے مطابق، عالمی سطح پر مسلمانوں میں کسی بھی مذہبی گروہ کے مقابلے میں سب سے زیادہ شرح پیدائش ہے۔ اس کے باوجود اب اس شرح میں بھی تیزی سے کمی آ رہی ہے اور ۱۹۹۵ء میں ۴٫۳ سے ۲۰۱۵ء میں ۲٫۹ تک کم ہو کر رہ گئی ہے۔ ۲۱ ممالک میں سے سات عرب ممالک ایسے تھے جہاں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر سے سال ۲۰۰۰ء کے وسط تک شرح پیدائش میں کمی ریکارڈ کی گئی تھی۔ ایران کے مذہبی رہنما جو طویل عرصے سے خواتین سے زیادہ بچے پیدا کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں وہاں شرح پیدائش ۱۹۸۴ء میں ۷٫۰ سے کم ہو کر ۱٫۷ رہ گئی ہے۔

آبادی کے یہ شماریات یہودی اسرائیلیوں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو مزید حیران کن بنا دیتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان ان کی شرح پیدائش ۳٫۴ سے کم ہو کر ۲٫۶ رہ گئی۔ اسرائیل نے اس رجحان کو روکنا شروع کر دیا۔ اب شرح پیدائش کو اس کی موجودہ سطح ۳٫۱ تک لے آئے ہیں۔

اندرونی صفحات پر

- یروشلم میں عیسائیت اور کلیسا کی صورتِ حال
- مقبوضہ کشمیر: ثقافتی اور مذہبی شناخت خطرے میں!
- روس، یوکرین جنگ۔ فوجی منصوبہ سازوں کے لیے ایک سبق
- شیر عباس ستانکزئی کے سخت لہجے کی وجہ؟
- پیوٹن کی کردار سازی کے اہم لمحات
- بھارت: مسلم نوجوان ایک بار پھر نشانے پر؟
- نوہندتو۔۔۔
- اقوام متحدہ میں اصلاحات کیوں اہم ہیں؟

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

شرح پیدائش میں تقریباً یہ تمام اضافہ اسرائیل کی طرف سے الٹرا آرتھوڈوکس (حریدی) یہودیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے ہوا ہے، جن کی شرح پیدائش ۶ء۶ ہے، جن کی قومی سطح پر شرح دوگنی ہے اور سیکولر یہودیوں کے مقابلے میں ان کی شرح تین گنا زیادہ ہے۔ تل ابیب یونیورسٹی (Tel Aviv University) اور شوریش انسٹی ٹیوٹ (Shoresh Institute) سے تعلق رکھنے والے ایک تھنک ٹینک کے ماہر اقتصادیات ڈین بین ڈیوڈ (Dan Ben-David) نے مشاہدہ کیا ہے کہ اسرائیل کی آبادی میں حریدی یہودیوں (Haredi Jews) کا حصہ ہر نسل میں کم وبیش دوگنا ہوجاتا ہے۔ اگرچہ حریدی، آبادی کا صرف ۱۳ فیصد ہیں، لیکن ان کی اولادیں ۱۴ سال سے کم عمر کے اسرائیلی بچوں کا ۱۹ فیصد اور چار سال سے کم عمر کے بچوں کا ۲۴ فیصد ہیں۔ اسرائیل کی شماریاتی ایجنسی کا خیال ہے کہ موجودہ رجحانات کے تحت ۲۰۶۵ء تک نصف اسرائیلی بچے حریدی ہوں گے۔

اس طرح کے نتائج ربیوں اور یہودی قوم پرستوں کے لیے خوش کُن ہوسکتے ہیں لیکن اس طرح اسرائیل کے کردار میں بھی تبدیلی رونما ہورہی ہے اور اس کی معیشت کے لیے خطرے میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ مسٹر بین ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ الٹرا آرتھوڈوکس یہودی زیادہ تر اپنے بیٹوں کو مذہبی اسکولوں میں پڑھنے کے لیے بھیجتے ہیں جب کہ انھیں ریاضی اور سائنس جیسے مضامین پڑھنے کی ضرورت ہے، جو اسرائیل کی ہائی ٹیک معیشت میں ملازمت کے لیے ضروری ہیں۔ حریدی مَردوں میں نصف سے بھی کم تعداد ایسی ہے جو افرادی قوت میں داخل ہوتی ہے۔ مَردوں کی یہ تعداد جوانی میں قدیم متون کا مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ ان کی اکثر مالی مدد ان کی بیویاں کرتی ہیں اور ریاست کی طرف سے انھیں مالی مراعات حاصل رہتی ہیں۔

حریدیوں میں شرح پیدائش اس درجے زیادہ رہنے کی کئی وجوہات ہیں۔ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اس طرح ہولوکاسٹ میں مارے گئے یہودیوں کی تلافی کرسکتے ہیں۔ کچھ کا یہ خیال ہے کہ یہودیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی خدا کی خدمت کررہی ہے۔ یرچ ٹوکر (Yerach Toker) کہتے ہیں کہ میں نے خاندانی منصوبہ بندی نہیں کی۔ میرے چھ بچے ہیں۔ بہت ساری چیزیں خدا کے دستِ قدرت میں ہیں۔ اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

حریدی خواتین بھی سیکولر یہودیوں کی نسبت کم عمری میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کا رجحان رکھتی ہیں۔ چونکہ الٹرا آرتھوڈوکس کمیونٹیز نے خود کو ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ جیسے بیرونی اثرات سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے، اس لیے وہ باقی دنیا میں شرح پیدائش کو کم کرنے والی قوتوں سے کسی حد تک محفوظ رہ سکے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بتانا مشکل ہے کہ آخر کیوں سیکولر یہودیوں کے بھی عام اسرائیلیوں کے مقابلے میں معمول سے زیادہ بچے ہیں۔ دراصل اسرائیل میں زیادہ تر افراد کام کرتے ہیں اور انہیں چھٹیوں کے دوران ملنے والی تنخواہ معمولی سی ہی ملتی ہے۔ دیگر امیر ممالک کی طرح وہاں بچوں کی دیکھ بھال کے اخراجات بھی بہت ہیں۔ کچھ لوگ دلیل دیتے ہیں کہ اسرائیلی یہودی زیادہ بچے اس لیے پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک روشن مستقبل کے منتظر ہیں۔ اسرائیلی خوش رہنے کے لحاظ سے دنیا کے دس بڑے ممالک میں شامل ہیں۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ریاست بچے پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر شرح پیدائش میں اضافے کے لیے علاج میں مالی مدد فراہم کی جاتی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب سے شرح پیدائش میں اضافے کے لیے اسرائیل سالانہ ۱۵۰ ملین ڈالر کی مالی مدد فراہم کرتا ہے۔ اس چھوٹے سے اسرائیل میں تقریباً اتنے ہی منجمد جنین (frozen embryos) موجود ہیں جتنے امریکا میں ہیں۔ اس کا اسرائیل میں شرح پیدائش میں اضافے کی صورت میں تھوڑا بہت اثر ہوسکتا ہے، لیکن یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ حکومت شرح پیدائش میں اضافہ چاہتی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور وضاحت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دیگر امیر ممالک کے مقابلے میں اسرائیلی دادا دادی اور نانا نانی اپنے بچوں کی زیادہ مدد کرتے ہیں۔ چونکہ اسرائیل چھوٹا اور گنجان آباد ہے۔ اس لیے یہ معمر رشتے کبھی دور نہیں ہوتے۔ ایک سروے میں ۲۵ سے ۳۹ سال کی ۸۳ فیصد سیکولر یہودی ماؤں نے کہا کہ انھیں ان کے بچوں کے دادا دادی اور نانا نانی نے مدد فراہم کی، جب کہ صرف ۳۰ فیصد جرمن ماؤں نے ایسا کہا۔ اسرائیل میں روایتی خاندانی ڈھانچا اب بھی مضبوط ہے۔ فرانس اور برطانیہ میں نصف سے زیادہ بچے شادی کے بندھن کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ اسرائیل میں یہ شرح ۱۰ فیصد سے بھی کم ہے۔

اسرائیلی یہودیوں اور عربوں کے حوالے سے شرح پیدائش کی صورت حال یہ بتاتی ہے کہ اب آبادی کے توازن کی اہمیت اتنی نہیں ہوگی جتنی اسرائیل یا فلسطینی قوم پرستوں کو اُمید تھی۔ چونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی زیادہ بچوں کے بل بوتے پر دوسرے کو دبا نہیں سکتا اس لیے دونوں کو اب یہ سوچنا پڑے گا کہ مشرق وسطیٰ کے متنازع حصے میں پُرامن طریقے سے کیسے رہنا ہے۔

(ترجمہ: جاوید احمد خورشید)

"Go forth and multiply".
("The Economist". Aug 18th 2022)

کویت پارلیمانی انتخابات کے نتائج

حافظ محمد عبداللہ

یکم اکتوبر کو کویتی پارلیمان (مجلس الامۃ) کے تازہ انتخابات کے نتائج کا حتمی اعلان کردیا گیا۔ نتائج کے مطابق درج ذیل تبدیلیاں واضح ہیں۔

پارلیمان میں کُل ۵۰ نشستیں ہیں۔ سابقہ تحلیل شدہ پارلیمان کے ۲۴ ارکان اس اسمبلی کا بھی حصہ ہیں۔ سابقہ پارلیمان کے ۲۰ ممبران اپنی نشستیں بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

۱۵ بالکل نئے چہرے انتخابات جیت کر پارلیمنٹ کا حصہ بنے ہیں۔ سابقہ پارلیمنٹ میں کوئی خاتون امیدوار کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ نئی پارلیمنٹ میں ۲ خواتین ممبران عام نشستوں پر کامیاب ہوکر پارلیمنٹ کا حصہ بنی ہیں۔

ان انتخابات میں اسلام پسند الحرکۃ الدستوریۃ الاسلامیۃ (حدس) کے نام سے میدان میں تھے۔ حدس کے ۴ ارکان جیت کر پارلیمان کا حصہ بن چکے ہیں اور ۲ امیدوار اپنے حلقوں میں دوسرے نمبر پر رہے (پارلیمان میں سلفی تحریک کے ارکان اور اسلام پسندوں کی کُل تعداد ۱۰ ہے) یوں نئی پارلیمان میں اسلام پسندوں کی ایک توانا آواز ہوگی۔

کویت میں وسط مدتی انتخابات کا اعلان (تصحیح المسار) سمت کی درستی کے نام سے کیا گیا تھا۔ ہدف یہ تھا کہ کویت کو اُس سیاسی بحران سے نکالا جائے جس میں قانون سازی کا اختیار رکھنے والی پارلیمان اور انتظامی اختیارات کی حامل حکومت کے درمیان تنازعات عروج پر رہے۔ تاہم حالیہ انتخابی نتائج حکومت کے لیے بھی پریشان کن ہیں۔

نئی پارلیمنٹ کا منظر نامہ کچھ اس طرح سے ہے کہ اسے اپوزیشن کی پارلیمنٹ قرار دیا جارہا ہے۔ عملاً ۱۵ ایسے ارکان پارلیمنٹ اپنی نشستیں کھو چکے ہیں جو حکومت کے قریب یا اس کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے حوالے سے بھی مشہور تھے۔

ان انتخابات کے نتیجے میں بظاہر کویت کے سیاسی منظر نامے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ عقابی نگاہ رکھنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ پارلیمنٹ اگر دو سے تین ماہ بھی نکال جائے تو اتفاق ہی ہوگا۔ اس لیے کہ حق قانون سازی کا استعمال کرتے ہوئے حکومتی ترجیحات یقیناً پارلیمنٹ کی ترجیحات نہیں قرار پاسکتیں اور تصادم اور بحران کی جس کیفیت سے نکلنے کے لیے وسط مدتی انتخابات کرائے گئے ہیں بظاہر وہ ختم ہوتا نظر نہیں آرہا۔

یروشلم میں عیسائیت اور کلیسا کی صورتِ حال

رضی الدین سید

اسرائیل میں عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد مقیم ہے۔ان کی تاریخ رومی شہنشاہ قسطنطین سے شروع ہوتی ہے، جب سینٹ پال کی تبلیغ کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ آسمان کے بعد اس نے عیسائیت قبول کر کے اپنی پوری رومی سلطنت کو بھی عیسائی سلطنت میں تبدیل کر دیا تھا۔اسی لیے پال کے خطبات ''رسولوں کے اعمال'' کتاب میں یروشلم میں گرجاؤں کا ذکر بھی ملتا ہے۔حضرت عیسیٰؑ چونکہ خود یہودی مذہب کے پیرو تھے اور انہوں نے یروشلم میں قیام کر لیا تھا، اس لیے وہاں اول اول تو یہودیوں اور حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں، اور پھر بعد میں سینٹ پال کے مریدوں اور خالص توحیدی مسیحیوں کے درمیان، مسلسل جھڑپیں ہوتی رہیں، حتیٰ کہ اصل مخلص توحیدی لوگ جان و مال بچانے کی خاطر یروشلم سے فرار ہوتے چلے گئے۔کچھ اس وجہ سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ساتویں صدی میں اسلام نے بھی وہاں غلبہ حاصل کر لیا تھا اور عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد یروشلم میں اسلام قبول کرنے لگی تھی، فلسطین میں عیسائیوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ۲۰۱۰ء کی مردم شماری کے مطابق اب اسرائیل میں صرف ۲ لاکھ عیسائی بستے ہیں، جو کل آبادی کا محض دو فیصد ہیں۔ان میں سے پچیس فیصد عیسائی، عرب ہیں۔ایک اقلیت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی بھی ہے جبکہ روسی عیسائیوں کی بھی مناسب تعداد یہاں موجود ہے۔عرب عیسائی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔

چونکہ حضرت عیسیٰؑ دینِ موسوی کے پیرو تھے، اس لیے اپنی عبادتیں وہ یہودیوں کے صومعوں ہی میں انجام دیا کرتے تھے۔اپنے لیے انہوں نے الگ سے کوئی عبادت گاہ، گرجا یا کلیسا کے نام سے نہیں بنائی تھی۔یہ کام البتہ سینٹ پال نے انجام دیا تھا اور اسی کے قائم کردہ کلیسا کو دنیا بھر کے کلیساؤں کی ماں کہا جاتا ہے۔

اسرائیلی آئین اگرچہ اسرائیل کو ایک یہودی ریاست قرار دیتا ہے لیکن باقی تمام مذاہب کو بھی عبادات و رسومات کی مکمل اجازت دیتا ہے۔تاہم ہر معاملے میں ایسا نہیں پایا جاتا۔بعض پادری اسے ایک منافقانہ چہرہ قرار دیتے ہیں۔ گرجاؤں کے خلاف یہودی نفرت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ایک بار انہوں نے کسی کلیسا کی دیوار پر حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ ''بندر'' لکھ دیا تھا۔اور ۲۰۱۰ء میں ایک گرجا کو یہ کہہ کر مسمار کر دیا تھا کہ وہ تمام جھوٹے خداؤں کا خاتمہ کر دیں گے۔واضح رہے کہ مسلمانوں کی مانند وہ بھی خود کو توحیدی قرار دیتے ہیں۔یہاں کے عیسائی اپنی ہم مذہب یورپی ریاستوں اور امریکا سے شکایت کنندہ ہیں کہ یہودی مظالم سے وہ انہیں تحفظ نہیں دیتے۔اسرائیلی عیسائی، اس موقف پر مسلمانوں کے حامی ہیں کہ اسرائیل بیک وقت ایک جمہوری و یہودی ملک نہیں ہوسکتا۔یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا میل ملاپ بہت کم ہے۔تازہ ترین اطلاع کے مطابق اسرائیلی حکومت نے گرجاؤں کی جائیداد پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے ہیں، جن کے بوجھ تلے عیسائی دبے چلے جا رہے ہیں۔اس ضمن میں اسرائیلی عیسائیت کمیشن کے سیکرٹری جنرل نے احتجاج کرتے ہوئے بیان دیا ہے کہ اسرائیل جانتے بوجھتے بیت المقدس میں قائم ہمارے کلیساؤں پر بھاری ٹیکس تھوپ رہا ہے جسے ادا کرنے کی ہم سکت ہی نہیں رکھتے۔۱۹۱ ملین ٹیکس کے نفاذ کا مطلب، کلیساؤں کی زمینوں، دکانوں اور اسکول و اسپتال سمیت تمام جائیدادوں پر حکومت کا قبضہ کر لینا ہے؟ (روزنامہ ''ایکسپریس ٹریبیون'' کراچی)

یروشلم میں سب سے قدیم یا اولین گرجا اس مقام پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں حضرت عیسیٰؑ کو ان کے بقول صلیب کے بعد دفن کیا گیا تھا اور جہاں سے تین دن بعد وہ دوبارہ جی اٹھے تھے۔

عیسائی مصنفہ کیرن آرم اسٹرانگ اپنی کتاب Jeruselum, One City Three Faith ترجمہ ''یروشلم ایک شہر تین مذاہب'' میں کہتی ہے کہ ''یروشلم کے قدیم مقدس مقام پر قبۃ الصخرہ جیسی عمارت کا شاہانہ وجود ایک ڈرامائی اِدعا تھا کہ اسلام یہاں تک پہنچ گیا ہے۔اور رہنے ہی کے لیے آیا ہے۔اس نے عیسائیوں کو ایک تحکمانہ دعوت دی تھی کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کر لیں اور حضرت ابراہیمؑ کی خالص توحید کی طرف رجوع کر لیں۔مسلمانوں نے یروشلم میں ایک ایسا نظام قائم کیا، جس نے پہلی مرتبہ یہودیوں، اور عیسائیوں، اور مسلمانوں کو اکھٹے رہنے کے قابل بنایا (ص۔۳۸۰۔۳۹۰)۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا میل ملاپ بہت کم ہے۔عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان ان کے ابتدائی دور میں جو خونی جھگڑے ہوا کرتے تھے، ان سے نمٹنے کی خاطر انہوں نے اپنے کلیسا کی چابی مسلمانوں کے حوالے کی ہوئی تھی۔چنانچہ اپنی عبادات کے لیے وہی اس چابی سے کلیسا کو کھولا اور بند کیا کرتے تھے۔جس کے بعد سے یہ انتظام آج تک بھی جاری ہے۔

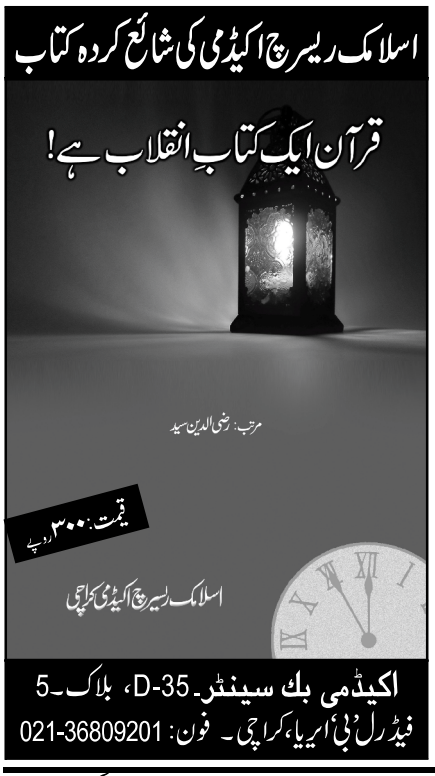

مقبوضہ کشمیر: ثقافتی اور مذہبی شناخت خطرے میں!

ملیحہ لودھی

بھارت کی حکمران جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) مسلسل کشمیری ثقافت اور شناخت پر حملے کر رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ مقبوضہ جموں و کشمیر میں ہندوتوا نظریات کو بھی فروغ دے رہی ہے۔

جموں و کشمیر کی سابق وزیرِ اعلیٰ محبوبہ مفتی نے اپنی ایک حالیہ ٹوئیٹ میں یہ نشاندہی کی ہے کہ کلگام اور دیگر علاقوں کے اسکولوں میں طلبہ کو بھجن گانے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ سوشل میڈیا پر ایک مسلمان طالبِ علم کی بھجن گانے کی وڈیو وائرل ہوئی جس کے نتیجے میں مسلمان تنظیموں نے سخت احتجاج کیا۔

۳۰ کشمیری تنظیموں پر مشتمل متحدہ علما کونسل نے اس عمل کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ عمل 'نوجوان نسل کی بھارتی ہندوتوا خیالات سے نام نہاد ہم آہنگی' کو تیز تر کرنے کی کوشش ہے۔ کونسل نے یہ بھی کہا کہ یہ اس خطے کی مسلم شناخت کو مٹانے کی کوشش ہے۔

متحدہ علما کونسل کی قیادت کشمیری رہنما میرواعظ عمر فاروق کرتے ہیں جو گزشتہ ۳ برسوں سے قید میں ہیں۔ علما کونسل نے حال ہی میں بھارت کی جانب سے مذہبی رہنماؤں کی گرفتاری کا حوالہ دیتے ہوئے اس عمل کو مسلمان علما کو دھمکانے اور ان کا کردار محدود کرنے کی کوشش قرار دیا ہے۔

گزشتہ ماہ کشمیر میں مسلم گروپوں پر کریک ڈاؤن کیا گیا اور کئی علما پر نام نہاد پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمات بنائے گئے جبکہ ۲ علما کو گرفتار کیا گیا۔ ان گرفتاریوں کی پاکستان کی جانب سے بھرپور مذمت کی گئی اور دفترِ خارجہ کے ایک بیان میں علما کی غیر قانونی گرفتاریوں کو 'بھارت کی جانب سے کشمیری عوام کو ان کی مذہبی اور ثقافتی شناخت سے محروم کرنے کی کوشش' قرار دیا۔

بی جے پی نے جموں و کشمیر وقف بورڈ کا کنٹرول بھی سنبھال لیا ہے جس کے نتیجے میں اس خطے میں موجود بورڈ کی تمام جگہیں بشمول سری نگر کی تاریخی عیدگاہ اب اسی کے کنٹرول میں ہے۔ کُل جماعتی حریت کانفرنس کے نائب سربراہ شبیر شاہ نے جیل سے دیے گئے اپنے بیان میں اس عمل کی مذمت کی ہے اور بی جے پی حکومت پر مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا ہے۔ دیگر کشمیری رہنماؤں نے اسے بی جے پی کی جانب سے مسلمانوں کے لیے مذہبی اہمیت کے حامل مقامات پر قبضے کی کوشش قرار دیا ہے۔ ان مقامات میں مزارات بھی شامل ہیں۔

ایک کشمیری صحافی نے مجھے بتایا کہ 'مزارات کا کنٹرول حاصل کرنا کوئی عام بات نہیں ہے، یہ ایک جابرانہ قدم ہے جس کا مقصد ان کے سیاسی کردار اور ان کی مسلم شناخت کو ختم کرنا ہے'۔

انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ مزارات کشمیر کے سیاسی و معاشرتی منظرنامے کا اہم حصہ رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مزارات 'نہ صرف عبادت کی جگہ ہیں بلکہ دہائیوں سے جاری قبضے کے نتیجے میں اب یہ وہ واحد مقام ہیں جہاں کشمیری آپس میں مل سکتے ہیں اور بات چیت کرسکتے ہیں۔ لیکن اب اس جگہ کو بھی چھین لیا گیا ہے'۔

بی جے پی نے کشمیری ثقافت کے خلاف مزید اقدامات بھی کیے ہیں۔

گزشتہ ۱۰۰ سال سے بھی زائد عرصے سے جموں و کشمیر کی سرکاری زبان اردو تھی لیکن ۲۰۲۰ء میں بھارت کی حکمران جماعت نے اردو کی یہ خصوصی حیثیت ختم کردی اور اردو اور انگریزی کے علاوہ ہندی، کشمیری اور ڈوگری زبان کو بھی جموں و کشمیر کی سرکاری زبان قرار دے دیا۔ اس وقت کشمیری زبان کے خط کو بھی نستعلیق سے دیوناگری خط میں تبدیل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مقبوضہ وادی میں موجود کشمیری ذرائع کے مطابق غیر اعلانیہ اور غیر سرکاری طور پر ایسا کیا جاچکا ہے۔

کشمیریوں کے حقوق غصب کرنے اور ان کی مسلم شناخت تبدیل کرنے کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات کا سلسلہ ۵ اگست ۲۰۱۹ء کے بعد سے شروع ہوا جب بھارت نے ریاست جموں و کشمیر کا غیر قانونی طور پر بھارت کے ساتھ الحاق کیا۔ بھارت نے آرٹیکل ۳۷۰ کو ختم کردیا جو ریاست جموں و کشمیر کو خصوصی حیثیت فراہم کرتا تھا۔ بھارت کا یہ عمل اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی کئی قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ یہ قراردادیں دونوں فریقین کو کشمیر کے حالات میں کوئی بھی مادی تبدیلی لانے سے روکتی ہیں۔

اس کے بعد بھارت نے جموں و کشمیر میں لاک ڈاؤن نافذ کیا اور رابطے منجمد کردیے۔ ساتھ ہی سیاسی رہنماؤں کے خلاف کریک ڈاؤن کرکے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں بھی کیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے 'وی آر بینگ پنشڈ بائے دی لا' کے نام سے ستمبر ۲۰۲۲ء میں ایک بریفنگ جاری کی۔ اس بریفنگ میں بتایا گیا کہ اگست ۲۰۱۹ء کے بعد کے ۳ سالوں میں 'بھارتی حکومت نے کشمیریوں کے متعدد انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ذریعے ان پر مزید جبر ڈھایا ہے۔ انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں میں اظہارِ رائے کی آزادی، فرد کی سلامتی اور آمدورفت، نجی زندگی اور انصاف تک رسائی کی آزادی کے حق کی خلاف ورزیاں شامل ہیں۔ حکومت نے بلاخوف ان حقوق کی خلاف ورزیاں کی ہیں'۔

بھارت نے بین الاقوامی قوانین اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے روگردانی کرتے ہوئے کشمیر کے مسلمانوں کو بے اختیار کرنے کے لیے انتظامی اور آبادیاتی تبدیلیاں کی ہیں۔ بھارت نے نئے ڈومیسائل قوانین متعارف کروائے ہیں اور اگست ۲۰۱۹ء کے بعد سے کشمیر سے باہر رہنے والے غیر کشمیریوں کو ۳۴ لاکھ ڈومیسائل جاری کیے ہیں۔ یہ غیر کشمیری افراد بھارتی آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵۔اے کے ختم ہونے کے بعد کشمیری ڈومیسائل کے اہل ہوئے۔ یہ اقدام اسرائیل کی غیر قانونی آبادکاری کی پالیسی کا عکس ہے اور قابض قوتوں کا ایک حربہ ہوتا ہے۔

مودی حکومت نے اپنی مرضی کی انتخابی حلقہ بندیاں بھی کیں تاکہ مسلمانوں کی نمائندگی کو کم کیا جاسکے اور خطے کا سیاسی توازن ہندوؤں کے حق میں کیا جاسکے۔

بھارت کے حلقہ بندی کمیشن نے مئی ۲۰۲۲ء میں نئے حلقے بنانے کا اعلان کیا تھا۔ یوں ۹۰ رکنی جموں و کشمیر اسمبلی میں جموں کی مزید ۶ نشستوں کا اضافہ ہوگیا جبکہ کشمیر کی نشستوں میں بھی ایک نشست کا اضافہ ہونا ہے۔ اس طرح جموں کی کُل نشستیں ۴۳ اور کشمیر کی کُل نشستیں ۴۷ ہوجائیں گی۔

اس اقدام کے پیچھے موجود عزائم کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری (بھارت میں اس کے بعد کوئی مردم شماری نہیں ہوئی) کے مطابق کشمیر کی آبادی تقریباً ۷۰ لاکھ جبکہ جموں کی آبادی تقریباً ۵۳ لاکھ ہے۔ یہ ۱۱ سال پرانے اعداد و شمار ہیں اور موجودہ اعداد و شمار کا تخمینہ اس سے زیادہ کا ہی ہے۔

ان حلقہ بندیوں کا مقصد ایسے انتخابات کروانا ہے جن کے نتیجے میں مودی حکومت یہ دعویٰ کرسکے کہ اب صورتحال

باقی صفحہ نمبر ۱۴

روس، یوکرین جنگ: فوجی منصوبہ سازوں کے لیے ایک سبق

افتخار گیلانی

۱۹۷۱ء کی بھارت۔ پاکستان جنگ کے بھارتی ہیرو فیلڈ مارشل سام جمشید جی مانک شا، جب کبھی دہلی آ کر اپنی بیٹی حقوق انسانی کی معروف کارکن ماجا دارووالا کے ہاں ٹھہرتے تھے، تو ملنے والوں کے لیے ان کے پاس ان گنت کہانیاں اور واقعات سنانے کے لیے ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ۲۶ مارچ، ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد ہی وزیراعظم اندرا گاندھی نے کابینہ کی سیاسی امور کی کمیٹی کے اجلاس میں ان کو مشرقی پاکستان پر چڑھائی کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ مگر انہوں نے کہا کہ ''فوج گو کہ ان کا حکم ماننے کی پابند ہے، مگر اس جنگ کا اختتام بھارت کی شکست پر ہوگا''۔ وضاحت طلب کرنے پر انہوں نے بتایا کہ ''مون سون اب شروع ہی ہونے والا ہے۔ مشرقی پاکستان کے ندی نالے اپنے جوبن پر ہوں گے۔ سڑکیں پانی سے لبریز ہوں گی، جو نہ صرف ہمارے ٹینکوں، بھاری اسلحہ اور نفری کا راستہ روکیں گے، بلکہ ان کے کیچڑ میں پھنسنے کا بھی خطرہ ہے''۔ انہوں نے اندرا گاندھی کو مشورہ دیا کہ چین کو بھی اس ملٹری آپریشن سے قبل روس کے ذریعے سنبھالنا ضروری ہے۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ سکم، جو تب تک ایک آزاد ملک تھا، کے راستے چینی فوج مشرقی پاکستان کی طرف کوچ کر سکتی ہے، اور سلی گوری راہداری پر قبضہ کر کے شمال مشرقی صوبوں کو بھارت سے الگ کر سکتی ہے۔ یعنی پاکستان کے بجائے بھارت ہی دولخت ہو جائے گا۔ یہ سن کر اندرا گاندھی میٹنگ برخاست کیے بغیر ہی کرسی سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ وزیر خوراک فخر الدین علی احمد نے مانک شا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''سام مان جاؤ''۔ مگر مانک شا نے اس کو جواب دیا۔ ''کہ کوچ کی صورت میں فوج کو تمام ٹرانسپورٹ کے ذرائع یعنی سبھی ٹرینیں اور ٹرک چاہییں۔ اس وقت کھیتوں میں ربیع کی فصل تیار ہو رہی ہے، اس کو مارکیٹ تک لے جانے کے لیے کوئی ٹرانسپورٹ مہیا نہیں ہوگی، جس کے نتیجے میں خوراک کی قیمتیں آسمان کو چھو جائیں گی اور بطور وزیر خوراک اس کا سارا ملبہ تمہارے اوپر پڑے گا اور تمہیں استعفیٰ دینا پڑے گا''۔ بتایا جاتا ہے کہ فخر الدین اس کے بعد اس جنگ کو دسمبر تک موخر کرنے کے بڑے حمایتی بن گئے۔

موجودہ تناظر میں لگتا ہے کہ روس نے جب فروری میں یوکرین پر فوج کشی کی، تو اس کے منصوبہ سازوں نے بارش کے موسم کو پلاننگ میں شامل نہ کر کے، روسی فوج کے لیے ہدف کا حصول مشکل بنا دیا اور جنگ کو طوالت بخشی۔ کئی ممالک کے فوجی ماہرین کے مطابق یہ جنگ بھارت، پاکستان، چین نیز امریکا کے لیے ایک سبق ہے۔ ماہرین کے مطابق وہ شاید کسی جدید طیارہ کے مار گرانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ اس سے فوج کے مورال پر اثر پڑ سکتا تھا۔ اس کے ہیلی کاپٹروں کو امریکی اسٹنگر اور ایس ۳۰۰ کے تال میل نے نشانہ بنا کر خاصا نقصان پہنچا دیا۔ روس ابھی بھی اس جنگ کو اسپیشل فوجی آپریشن کا نام دیتا ہے۔ کیونکہ ابھی تک اس نے اسٹرائیک کور کو اس میں استعمال نہیں کیا ہے، جبکہ اس کو سرحدوں پر تیاری کی حالت میں رکھا گیا ہے۔ اسی لیے ابھی تک اس جنگ میں روس نے کئی جدید میزائلوں یعنی کالیبار، کے ایچ ۵۹، کے ایچ ۱۰۱، اسکندر اور سپر سانک کنزال میزائلوں کا استعمال کر کے خاصی تباہی مچادی۔ چونکہ دونوں اطراف مضبوط فضائی دفاعی ہتھیار نصب ہیں، تو زمینی افواج کی مدد کے لیے نیچی پرواز کرنے والے ہوائی جہاز کوئی بھی اڑانے کا رسک نہیں لے رہا ہے۔ جنگی ماہرین کا کہنا ہے کہ جوں جوں جنگ طوالت اختیار کرتی گئی، تو روس کے لیے کئی میزائل سسٹم کم پڑتے گئے۔ مغربی ممالک کی طرف سے عائد پابندیوں کی وجہ سے ان کے لیے مطلوبہ پرزے ملنا مشکل ہو گئے ہیں۔ سائبر اور مواصلات کے حوالے سے یہ جنگ پوری دنیا میں فوجی منصوبہ سازوں کے لیے ایک سبق ہے۔ روس نے ابتدا ہی میں یوکرین کو امریکا کی طرف سے فراہم کردہ وی سیٹلائٹ کو ہی ہیک کر دیا تھا۔ بعد میں امریکا نے انتہائی جدید اسپیس ایکس سیٹلائٹ کو اس جنگ کے لیے وقف کر دیا، جس نے یوکرین کو انٹیلی جنس مہیا کرنے کے علاوہ مواصلات کے رابطوں کو بحال رکھنے میں مدد دی۔ انفارمیشن وارفیئر میں امریکی کمپنیوں ایپل، مائکرو سافٹ، ایمیزن اور اسپیس ایکس نے یوکرین کی کافی مدد کی اور روس کو زچ کیا۔ اب تمام ممالک پر لازم ہو گیا ہے کہ زمینی، فضائی اور بحری افواج کے علاوہ سافٹ ویئر کے ماہرین کی بھی ایک فوج تیار رکھیں۔ ماہرین کے مطابق اس جنگ کے بعد کئی ممالک جن میں بھارت، پاکستان، چین اور امریکا بھی شامل ہیں، اپنی جنگی حکمت عملی یا منصوبہ بندی کی از سر نو تشکیل کریں گے۔ امریکا کے لیے یہ پہلی ایسی جنگ ہے جہاں اس کے مدمقابل کو اسی طرح کی ہی ٹیکنالوجی حاصل ہے۔ گو کہ اس سے قبل عراق اور افغانستان میں امریکی افواج نے جنگیں لڑی ہیں، مگر اس کا حریف ٹیکنالوجی کے حوالے سے اتنا طاقتور نہیں تھا۔ عراقی جنگجو یا طالبان، الیکٹرانک وارفیئر اور ڈرون کے استعمال سے ناواقف تھے۔ دیگر ممالک کے لیے بھی یہ ایک سبق ہی ہے کہ جنگ شروع تو کی جاسکتی ہے، مگر اس کا خاتمہ اپنے بس میں نہیں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بھارتی فوج کے سربراہ جنرل منوج پانڈے کے مطابق اس جنگ کا بڑا سبق یہ ہے کہ فوجی آپریشن کے لیے لاجسٹکس اہم رول ادا کرتی ہے۔ نقل و حمل، ملٹری و سول انفرا اسٹرکچر نیٹ ورک اور مواصلات کا رول جنگوں میں اتنا ہی اہم ہے، جتنا ہتھیاروں کا حصول۔ ۲۰۰۹ء میں بتایا گیا تھا کہ بھارتی فوج نے ۳۰ سے ۶۰ دن کے تیل اور اسلحے کے ذخائر رکھنے کا ایک پلان بنایا ہے۔ مگر ۲۰۱۷ء میں آڈیٹر جنرل کے مطابق ان کے اسٹوریج کی میقات ۱۰ سے ۲۰ دن تک ہی ہے۔ یعنی اس سے زیادہ دنوں تک بھارت جنگ جاری رکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں بتایا گیا کہ بھارتی فوج نے ۱۵ دن تک شدید جنگ لڑنے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ مگر چین اور پاکستان کے مقابلے بھارت کی کمزوری لاجسٹکس شعبے میں ہے۔ خاص طور پر چین سے ملحق علاقوں میں نقل و حمل کے ذرائع خاصے محدود ہیں۔ دفاعی تجزیہ کار منوج جوشی کے مطابق اس جنگ کا ماحاصل یہ ہے کہ لیڈر شپ کا شعور و مہارت، لاجسٹکس کا ادراک، فوج کی روایتی یک کمانڈ کے بجائے افسران کو فیصلہ کرنے کی آزادی اور ڈرون کا رول پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس جنگ میں دور مار میزائلوں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اہمیت بھی اجاگر ہوئی ہے۔ دنیا بھر کی ملٹری انڈسٹریز کو اب ٹینکوں کے ڈیزائن تبدیل کرنے پڑیں گے، کیونکہ اس جنگ میں ان کو خاصی مار پڑی ہے۔ گو کہ دنیا بھر کی ملٹری ڈاکٹرائن ابھی بھی مختصر اور تیز ترین جنگوں کے منظر ناموں پر عمل پیرا رہے گی، جس میں پیرا کمانڈوز اور اسپیشل فورسز کا رول اہم رہے گا، مگر یوکرین جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس طریقہ کار سے یہ ضروری نہیں ہے کہ جنگ فیصلہ کن طریقے سے جیتی جاسکے، اس لیے ایک بار پھر اسٹرائیک کور کو بہتر بنانے اور ان کو ہی جنگ کی اولین کمانڈ دینے کے روایتی طریقے کی طرف لوٹنا ہوگا۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۲۷ ستمبر ۲۰۲۲ء)

شیر عباس ستانکزئی کے سخت لہجے کی وجہ؟

طاہر خان

پاکستان اگر روزانہ بین الاقوامی برادری سے طالبان حکومت کے ساتھ رابطوں کی بات کرتا ہے تو خود بھی سوچ لے کہ کابل میں ہر حکومت کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ کیوں رہتا ہے؟

پاکستان نے افغانستان میں طالبان حکومت کے نائب وزیر خارجہ شیر عباس ستانکزئی کے اس حالیہ بیان پر سخت ردعمل کا اظہار کیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان نے گزشتہ ۲۰ سالوں میں افغانستان پر تجارت کی ہے۔

پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان عاصم افتخار نے بیان کو 'انتہائی افسوسناک اور ناقابل قبول' قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو اس بیان پر تشویش ہے کیونکہ اس طرح کے بیانات دونوں ممالک کے 'دوستانہ تعلقات کی روح کے خلاف' ہیں۔

سخت بیانات کا تبادلہ جب اجتماعات اور میڈیا میں ہوتا ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں جہاں دوطرفہ مذاکرات کے لیے موجود ایک باقاعدہ نظام کو نظرانداز کر کے میڈیا کا سہارا لیا جاتا ہے۔

گزشتہ سال اکتوبر میں اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے دورہ کابل میں طالبان حکومت اور پاکستانی حکام نے اتفاق کیا تھا کہ سابق صدر اشرف غنی کے دور میں مذاکرات کے لیے شروع کیے گئے افغانستان پاکستان ایکشن پلان برائے امن و یکجہتی (اے پی اے پی پی ایس) کو استعمال کیا جائے گا۔

لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا اور دونوں اس میکنزم کو غیر موثر بنانے کے ذمہ دار ہیں کیونکہ بیانات میں 'بلیم گیم' کی روایت کو جاری رکھا گیا ہے۔

شیر عباس ستانکزئی کو وزیر اعظم شہباز شریف کی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۲۳ ستمبر کی تقریر پر سخت غصہ تھا، جس میں انہوں (شہباز شریف) نے بین الاقوامی برادری کے افغانستان میں غیر ملکی شدت پسند تنظیموں کی موجودگی اور ان کی سرگرمیوں سے دنیا کے امن کو ممکنہ خطرے سے اتفاق کیا تھا۔

شہباز شریف نے القاعدہ، داعش، چینی مسلمانوں کی تنظیم مشرقی ترکستان اسلامی تحریک، ازبک گروپ اسلامک موومنٹ آف ازبکستان (آئی ایم یو) اور تحریک طالبان پاکستان کا نام لیا تھا۔

جب ۳۰ ستمبر کو ایک خودکش حملہ آور نے کابل میں ایک اسکول کے طلبہ و طالبات کو نشانہ بنایا تو شہباز شریف نے اپنی ٹویٹ میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں افغانستان میں دہشت گردی کے خطرے سے متعلق اپنی تقریر کا حوالہ بھی دیا۔

کابل میں اقوام متحدہ کے دفتر نے تین اکتوبر کو ایک ٹویٹ میں کہا کہ ہزارہ برادری کے ایک تعلیمی ادارے پر حملے میں ہلاک ہونے والے طلبہ و طالبات کی تعداد ۵۳ اور زخمیوں کی تعداد ۱۰۰ سے بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ کسی گروپ نے اس حملے کی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے لیکن اہل تشیع کے علاقے دشت برچی میں ماضی میں عوامی مقامات پر حملوں کی ذمہ داری داعش نے قبول کی ہے۔

ویسے تو افغان وزارت خارجہ نے پاکستانی وزیر اعظم، امریکی صدر اور کئی دیگر سربراہان کے افغانستان سے متعلق ریمارکس پر باضابطہ ردعمل جاری کیا تھا لیکن افغان عبوری نائب وزیر خارجہ کے بیان میں پاکستان سے متعلق لہجہ بہت سخت تھا۔

شیر عباس ستانکزئی نے اپنی تقریر میں صرف پاکستانی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بلاول بھٹو کے امریکا میں بیانات کا ذکر کیا اور اقوام متحدہ میں کسی دوسرے ملک کے سربراہ کی تقریر کا اشارہ تک نہیں کیا۔

یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پاکستان اور طالبان حکومت کے درمیان کتنی بداعتمادی موجود ہے۔ افغان نائب وزیر خارجہ کے بیان پر طالبان حکومت کی خاموشی کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ یہ طالبان کی اسلامی امارت کا موقف ہے۔

پاکستان اکثر افغان رہنماؤں کے بیانات پر خاموشی اختیار کرتا ہے لیکن ستانکزئی کے بیان کی شدت شاید اسلام آباد میں کچھ زیادہ ہی محسوس کی گئی اور وزارت خارجہ کے ترجمان ۳۰ ستمبر کی ہفتہ وار بریفنگ میں تفصیلی جواب دینے پر مجبور ہو گئے۔

شیر عباس ستانکزئی کا پاکستان سے متعلق لہجہ اتنا سخت تھا جو شاید ہی کسی اور طالبان رہنما نے کبھی استعمال کیا ہو۔ طالبان رہنما کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ 'پاکستان کو کوئی دوست اور اسلامی ملک پیسے نہیں دیتا، ان کے فون کوئی نہیں سنتا تو اب پاکستانی رہنما افغانستان کے نام پر پیسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں'۔

افغان نائب وزیر خارجہ نے یہ بھی کہا کہ ان کے پاس پاکستانی کردار سے متعلق بہت شواہد اور ثبوت موجود ہیں اور وقت آنے پر ان سب کا حساب کیا جائے گا۔ پاکستان کے لیے ستانکزئی کا بیان پریشانی کا باعث ضرور ہوگا کیونکہ ایک پبلک فورم اور طالبان کے بہت سے رہنماؤں کی موجودگی میں اس طرح کے بیان کی شاید پاکستان میں توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

اگر وزیر اعظم شہباز شریف ایک بین الاقوامی فورم پر افغانستان میں شدت پسند گروپوں کی موجودگی کا ذکر کریں تو طالبان حکومت کا سخت ردعمل فطری ہوگا۔ طالبان حکومت کے اس طرح کے بیانات اور پھر پاکستانی رہنماؤں کی جانب سے بیانات پر حساسیت زیادہ ہے جس کا اظہار نائب وزیر خارجہ نے نسبتاً سخت الفاظ میں کیا ہے۔

معاملہ صرف شہباز شریف کی تقریر کا نہیں بلکہ حالیہ کئی دیگر معاملات نے بھی تعلقات میں کسی حد تک بگاڑ پیدا کیا ہے۔

پاکستان شاید دنیا کا واحد ملک تھا جس نے القاعدہ سربراہ ایمن الظواہری کو مارنے کے لیے کابل کے ایک گھر پر امریکی ڈرون حملے کی کسی حد تک حمایت کی۔ جس حملے کی طالبان مذمت کریں اور پاکستان حمایت کرے تو ان حالات میں طالبان حکومت اور اسلام آباد کے درمیان بداعتمادی کیسے ختم ہو سکتی ہے؟

پاکستان نے افغان وزیر دفاع ملا یعقوب کے اس بیان کی تردید نہیں کی ہے کہ امریکی ڈرون طیارے پاکستان کی فضائی حدود سے افغانستان میں داخل ہو رہے ہیں، بلکہ طالبان کو ان کا اپنا وعدہ یاد دلایا کہ غیر ملکی شدت پسند گروپوں کو افغان سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

کابل پر گزشتہ سال اگست میں طالبان کے کنٹرول کے بعد پانچ مرتبہ افغانستان جانے کے دوران محسوس کیا گیا کہ طالبان رہنماؤں کا پاکستان پر اعتماد کا فقدان ہے۔ یہ پاکستان کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے لیکن پاکستان میں شاید ہی اس کا ادراک اور احساس ہو۔

اسلام آباد میں افغان امور سے متعلق پاکستانی ذمہ داران اعلیٰ حکومتی رہنماؤں کو 'سب اچھا' کی رپورٹ دیتے ہیں لیکن یہ لوگ بھی زمینی حقائق کو نظرانداز ہی کرتے ہیں۔

کابل پر ۳۱ جولائی کو ڈرون حملے کے بعد پیدا ہونے والی بداعتمادی کے بعد پاکستان کا کالعدم جیش محمد کے سربراہ مسعود اظہر کی افغانستان میں موجودگی سے متعلق طالبان حکومت کو لکھا گیا خط مبینہ طور پر میڈیا میں لیک کرنے پر طالبان حکومت کے ترجمان ذبیح اللہ مجاہد کا سخت ردعمل سامنے آیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ 'مسعود اظہر تو پاکستانی اداروں کے زیر سرپرستی پاکستان میں رہ سکتے ہیں۔ طالبان رہنماؤں کا خیال تھا کہ پاکستان مسعود اظہر کی افغانستان میں موجودگی کا کہہ کر بین الاقوامی دباؤ ہٹانا چاہتا ہے اور درحقیقت طالبان حکومت کے لیے مشکلات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔'

اب جبکہ کابل میں پاکستانی سفیر نہ ہونے کی وجہ سے سفارتی نمائندگی کم ہوگئی ہے، پاکستان کوشش کر رہا ہے کہ نامزد ناظم الامور عبید الرحمٰن نظامانی کو جلد از جلد کابل بھیجا جائے تاکہ رابطوں کا سلسلہ بحال ہو جائے جو کہ اگست میں سفیر منصور خان کی سفارتی ذمہ داریاں پوری ہونے کے بعد کسی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔

وزارت خارجہ میں یورپ ڈیسک کے سربراہ کو افغانستان کے لیے ناظم الامور مقرر کیا گیا ہے کیونکہ طالبان حکومت کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے سفیر کی تقرری نہیں کی جاسکتی۔

ناظم الامور کابل جانے سے پہلے اسلام آباد میں صدر مملکت ڈاکٹر عارف علوی اور کئی دیگر وزرا سے ملاقاتیں کر چکے ہیں۔

اسلام آباد میں سرکاری ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وزیر خارجہ بلاول بھٹو زرداری یا وزیر مملکت برائے امور خارجہ حنا ربانی کھر کو کابل بھیجنے کے لیے مشورے ہو رہے ہیں تاکہ کشیدگی کے خاتمے میں مدد مل سکے۔

ذرائع کے مطابق مجوزہ دورے کے لیے افغان حکام کے جواب کا انتظار ہے۔ اگرچہ مجوزہ دورہ ایک لحاظ سے کشیدگی کم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے، لیکن اس مقصد کا حصول اتنا آسان نہیں۔

پاکستان اگر روزانہ بین الاقوامی برادری سے طالبان حکومت کے ساتھ رابطوں کی بات کرتا ہے تو خود بھی سوچ لے کہ کابل میں ہر حکومت کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ کیوں رہتا ہے؟ پاکستان میں جب تک افغان معاملات پر سویلین قیادت اور پارلیمان کا کنٹرول نہیں ہوتا تو تعلقات میں بہتری کا سوچنا بھی اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہوگا۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۶ اکتوبر ۲۰۲۲ء)

اوّل صدارتی ایوارڈ یافتہ

سیرتِ سید الابرار ﷺ

منیر احمد خلیلی

قیمت: ۱۲۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

پیوٹن کی کردار سازی کے اہم لمحات

مارک گیلیوٹی

روسی صدر ولادیمیر پیوٹن آج ۷۰ برس کے ہو چکے ہیں۔ اُن کی سالگرہ کے موقع پر یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اچانک ایسے خود پرست رہنما کیسے بن گئے کہ انھوں نے یوکرین پر ایک تباہ کن حملہ کر ڈالا۔

ان کی زندگی کے سات ایسے لمحات پر نظر دوڑاتے ہیں جو ان کی سوچ کے تعین اور مغرب سے ان کی بڑھتی مفارقت میں اہم ثابت ہوئیں۔

۱۹۶۴ء میں جوڈو سیکھنے کا فیصلہ

پیوٹن روس کے شہر لینن گراڈ میں پیدا ہوئے تھے جو اس وقت تک بھی دوسری عالمی جنگ میں ۸۷۲ دن طویل محاصرے کے بعد سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم پیوٹن اسکول میں ایک غصیلے اور جھگڑالو بچے تھے۔ ان کے بہترین دوست یاد کرتے ہیں کہ وہ 'کسی کے ساتھ بھی لڑائی کر لیتے تھے' کیونکہ 'انھیں کسی کا ڈر نہیں تھا۔'

درمیانے قد کاٹھ کے مالک پیوٹن کو ایک ایسے شہر میں دوسروں پر برتری حاصل کرنے کے لیے کچھ الگ کرنا تھا جہاں ہر گلی میں ایک گینگ موجود تھا۔ اس لیے ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے روسی مارشل آرٹ 'سامبو' سیکھنے کا فیصلہ کیا اور پھر جوڈو سیکھنے لگے۔

وہ پُرعزم اور نظم وضبط کے پابند تھے اور جب وہ ۱۸ سال کے ہوئے تو اُن کے پاس ایک جوڈو بلیک بیلٹ تھی اور وہ قومی جونیئر مقابلے میں تیسری پوزیشن پر آئے تھے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے ان پہلوؤں کو اپنے ظاہری کردار میں مردانگی کا عنصر نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا۔ لیکن اس سے اُن کا اِس بات پر یقین بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک خطرناک دنیا میں خود اعتمادی اہم ہے اور اُن کے اپنے الفاظ میں جب ایک لڑائی ناگزیر ہو جائے تو 'آپ کو وار کرنے میں پہل کرنی چاہیے اور اتنی کاری ضرب لگانی چاہیے کہ آپ کا دشمن اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے۔'

۱۹۶۸ء میں کے جی بی سے نوکری دینے کی درخواست کرنا

عام طور پر لوگ لینن گراڈ میں واقع کے جی بی (روس کی خفیہ ایجنسی) کے سیاسی ہیڈکوارٹر پر جانے سے اجتناب کرتے تھے۔ اکثر افراد اسٹالن کے دور میں اس میں موجود عقوبت خانوں میں رہ چکے تھے اور ان کے لیے اب یہ بات طنزاً کہی جاتی تھی کہ بوشوئی ڈوم (بڑا گھر) لینن گراڈ کی سب سے اونچی عمارت ہے کیونکہ اس کے تہہ خانے سے سائبیریا نظر آتا ہے۔

تاہم ۱۶ برس کی عمر میں پیوٹن اُس کے سرخ قالین سے آویزاں استقبالیے میں داخل ہوئے اور ڈیسک کے پیچھے بیٹھے افسر سے پوچھا کہ وہ تنظیم (کے جی بی) کا حصہ کیسے بن سکتے ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ انھیں ایسا کرنے کے لیے کچھ عرصہ فوج میں کام کرنا ہوگا یا ڈگری حاصل کرنی ہوگی، اس پر پیوٹن نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کون سی ڈگری سب سے موزوں رہے گی؟

انھیں بتایا گیا کہ قانون کی ڈگری بہترین رہے گی اور اس کے بعد سے پیوٹن نے قانون میں گریجویشن کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا، جس کے بعد انھیں تنظیم کا باضابطہ حصہ بنا لیا گیا۔ ذہین اور ہوشیار لیکن لڑاکا پیوٹن کے لیے کے جی بی شہر کا سب سے بڑا گروہ تھا جو اسے بھی سکیورٹی اور ترقی کے مواقع فراہم کرتا تھا جس کا تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

تاہم اس کا حصہ بننے سے انھیں چیزیں تبدیل کرنے اور بااثر ہونے کے مواقع بھی ملے، جیسے انھوں نے لڑکپن میں دیکھی گئی جاسوسی فلموں کے بارے میں کہا تھا کہ 'ایک جاسوس ہزاروں افراد کی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔'

۱۹۸۹ء میں جب پیوٹن کا ایک مشتعل ہجوم نے گھیراؤ کیا

پیوٹن کا 'کے جی بی' کے ساتھ کریئر کبھی بھی اتنا خوش آئند نہیں رہا جتنا وہ سوچ رہے تھے۔ وہ ایک اچھے کارکن ضرور تھے لیکن ان کی کارکردگی غیر معمولی نہیں تھی۔ تاہم انھوں نے جرمن زبان سیکھی جس کے باعث انھیں ۱۹۸۵ء میں اس وقت مشرقی جرمنی کے شہر ڈریسڈن میں کے جی بی کے رابطہ دفاتر میں تعینات کیا گیا۔

یہاں انھوں نے ایک پرسکون زندگی کا آغاز کیا لیکن نومبر ۱۹۸۹ء میں مشرقی جرمنی کی حکومت کو انتہائی تیزی سے زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

پانچ دسمبر کو ایک مشتعل ہجوم نے ڈریسڈن میں 'کے جی بی' کی عمارت کا گھیراؤ کیا۔ پیوٹن نے بار بار قریبی ریڈ آرمی گیریسن سے مدد کی درخواست کرنے کے لیے رابطے کیے اور انھوں نے مایوسی سے جواب دیا 'ہم ماسکو سے احکامات کے

بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے اور ماسکو خاموش ہے۔'

پیوٹن کو طاقت کے مرکز کے اچانک منہدم ہونے سے منسلک خوف کا اس روز احساس ہوا اور انھوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ وہ سوویت رہنما میخائل گورباچوف کی غلطی کبھی نہیں دہرائیں گے، یعنی مخالفت کا جواب فوری اور مؤثر انداز میں دینے سے نہیں گھبرائیں گے۔

۱۹۹۲ء میں 'کھانے کے بدلے تیل' کے پروگرام کی ذمہ داری

پیوٹن نے سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد 'کے جی بی' چھوڑ دی لیکن پھر سینٹ پیٹرزبرگ کے میئر کے فلکسر کی پوزیشن پر تعینات ہوئے۔

اس دوران، معیشت کا بہت بُرا حال تھا اور پیوٹن کو ایک ایسا معاہدہ کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی جس سے شہر کے لوگوں کی غذائی ضروریات پوری ہوسکیں۔ پیوٹن نے ۱۰ کروڑ ڈالر کے تیل اور دھات کے بدلے غذائی اشیا کا معاہدہ کیا۔ تاہم اصل میں کسی نے بھی یہ کھانے پینے کی اشیا نہیں دیکھیں اور بعد میں اس بارے میں کی گئی تحقیقات جو پیوٹن کی جانب سے فوری طور پر دبا دی گئیں، پیوٹن ان کے دوستوں اور شہر کے گینگسٹرز نے مل کر اس معاہدے کی رقم کو غبن کیا تھا۔

سیاسی طور پر انتہائی غیر یقینی کا شکار، پیوٹن ۹۰ کی دہائی میں بہت جلد یہ سمجھ چکے تھے کہ سیاسی اثر و رسوخ کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور گینگسٹرز کو اہم اتحادی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ جب ان کے اردگرد سب ہی اپنے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھا رہے ہیں تو وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔

۲۰۰۸ء میں جارجیا پر حملہ

جب پیوٹن ۲۰۰۰ء میں روس کے صدر بنے تو انھیں امید تھی کہ وہ مغرب کے ساتھ مثبت تعلقات کی راہ ہموار کریں گے اور وہ ایسا اپنی شرائط پر کرنا چاہتے تھے اور سابق سوویت یونین کے ممالک پر اپنا اثر و رسوخ بھی بنانا چاہتے تھے۔ تاہم وہ بہت جلد مایوس، اور برہمی کا شکار ہو گئے اور اُن کا خیال تھا کہ مغرب روس کو دیوار سے لگانے اور اسے رسوا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جب جارجیا کے صدر میخائل ساکاشویلی نے نیٹو کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا تو پیوٹن نے اسے جارجیا کا روسی حمایت کے ساتھ علیحدہ ہونے والے خطے جنوبی اوسیٹیا پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کا ارادہ سمجھا اور یہ ان کے لیے ایک فوجی آپریشن کا بہانہ بن گیا۔

صرف پانچ دنوں میں روسی فوج نے جارجیا کی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور زبردستی ساکاشویلی میں امن معاہدہ کروالیا۔

مغرب نے اس اقدام پر برہمی کا اظہار کیا لیکن صدر باراک اوباما ایک سال بعد روس سے تعلقات کے 'از سرِ نو' آغاز کی بات کر رہے تھے اور ماسکو کو ۲۰۱۸ء کے ورلڈ کپ کی میزبانی کا حق بھی دیا گیا۔

پیوٹن کو یہاں یہ واضح ہو چکا تھا کہ 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' اور ایک کمزور اور غیر مستقل مزاج مغرب صرف شور و غوغا کرے گا لیکن آخر کار ایک پرعزم مخالف کا سامنا نہیں کر سکے گا۔

۱۳-۲۰۱۱ء کے دوران ماسکو میں مظاہرے

روس میں ۲۰۱۱ء کے انتخابات کے بارے میں یہ رائے عام تھی اور یہ مصدقہ بھی تھی کہ اس سال ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں دھاندلی کی گئی تھی اور جب پیوٹن نے ۲۰۱۲ء میں دوبارہ انتخابات میں کھڑے ہونے کا اعلان کیا تو اس کے باعث مظاہرے ہونا شروع ہوئے۔ ماسکو اسکوائر مظاہرین سے بھرنے کے باعث ان مظاہروں کا نام 'بولوتنایا مظاہرے' رکھا گیا اور یہ پیوٹن کے خلاف عوامی ردِعمل کا سب سے بڑا اظہار تھا۔

انھیں یقین تھا کہ ریلیوں کے پیچھے دراصل واشنگٹن کا براہ راست ہاتھ تھا اور وہیں سے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، اس لیے انھوں نے امریکی وزیرِ خارجہ ہلری کلنٹن کو براہ راست اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

پیوٹن کے لیے شاید یہ ثبوت تھا کہ اب مغرب کی جانب سے جارحانہ انداز اپنایا جا چکا ہے اور وہ براہ راست ان کے خلاف ہیں اور یہ کہ اب وہ حالتِ جنگ میں ہیں۔

۲۱-۲۰۲۰ء میں کووڈ کے پھیلاؤ کے باعث علیحدہ رہنا

جب ۲۰۲۰ء میں کووڈ-۱۹ پوری دنیا میں پھیلا تو پیوٹن نے ایک غیر معمولی علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، جو ان کی طرح کے رہنماؤں کے لیے بھی غیر معمولی تھا۔ ان سے ملنے کی خواہش کرنے والے کسی بھی شخص کو ۱۴ روز کے لیے قرنطینہ میں رکھا جاتا اور اس دوران اسے پہرے میں رکھا جاتا تھا اور پھر ان تک پہنچنے سے پہلے اس شخص پر جراثیم کش الٹراوائلٹ روشنی اور سپرے کیا جاتا۔

اس دوران ان سے ملنے والے اتحادیوں اور مشیروں کی تعداد میں ڈرامائی کمی آئی اور صرف ان کے خوشامدی اور حمایتی ہی ان سے ملنے جایا کرتے۔

ایسے میں انھیں متبادل آرا سننے کو نہیں مل رہی تھیں اور وہ اپنے ملک کو بہت کم دیکھا کرتے تھے، پیوٹن نے شاید یہ 'سیکھ' لیا تھا کہ ان کے تمام مفروضے سچے تھے اور ان کی ذہن میں موجود فرسودہ خیالات بھی جائز تھے اور یوں ان کے ذہن میں یوکرین پر حملہ کرنے کے خیالات نے جنم لیا۔

پروفیسر مارک گیلیوٹی ایک محقق اور مصنف ہیں۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ ۷/اکتوبر ۲۰۲۲ء)

●●●

بقیہ: اقوام متحدہ میں اصلاحات کیوں اہم ہیں؟

یہ سچ ہے کہ اقوام متحدہ میں فوری اور طویل مدت سے ملتوی ہونے والی اصلاحات پر بات ہوئی ہے، اس میں کچھ ممالک یہ چاہتے ہیں کہ یہ اصلاحات موجودہ جمہوری اور معاشی حقیقتوں کی عکاسی کرے جب کہ کچھ دوسرے ممالک یہ چاہتے ہیں کہ انہیں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت ملے، جب کہ مغرب یہ چاہتا ہے کہ جتنا زیادہ ممکن ہو سکے عالمی طاقت کا توازن نہ بگڑے بلکہ جیسے چل رہا ہے ویسا چلتا رہے۔

ان تمام مسئلوں کے باوجود اقوام متحدہ کی اصلاحات کے لیے جو کہ ایک عظیم مقصد کے لیے کام آسکیں یا یہ کہ طاقت کی تقسیم کو منصفانہ بنایا جا سکے بجائے اس کے اسے معاشی، سیاسی یا عسکری بنیادوں پر تقسیم کیا جا سکے اور ان اصلاحات کے وجود میں آنے تک اقوام متحدہ دنیا کے موجودہ مسئلوں کے ایک افسوسناک اظہار کے سوا کچھ نہیں ہے نہ کہ وہ کروسی کے زبان میں ''حل کا کنواں'' ہے۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

"'Well of solutions' or problems: Why reforming the UN is critical".
("middleeastmonitor.com". September 29, 2022)

●●●

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

عالمی مسائل کے تناظر میں

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پروفیسر ڈاکٹر سید صلاح الدین احمد

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

بھارت: مسلم نوجوان ایک بار پھر نشانے پر؟

افتخار گیلانی

ہندو انتہا پسندوں کی مُربّی تنظیم آر ایس ایس کے سربراہ موہن بھاگوت کی چند مسلم دانشوروں کے ساتھ میٹنگ اور اس کے بعد ان کا ایک مسجد و مدرسہ کے دورے سے لگ رہا تھا کہ شاید اس آؤٹ ریچ کے بعد مسلمانوں کو سانس لینے کا موقع فراہم ہوگا۔ مگر اس کے چند ہی دنوں کے بعد پورے ملک میں مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم پیپلز فرنٹ آف انڈیا (پی ایف آئی) پر شکنجہ کس دیا گیا۔ نہ صرف الزامات کی بوچھاڑ کر کے اس پر پابندی لگائی گئی، بلکہ پورے ملک میں ابھی تک چھاپوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں ۲۵۰ کے قریب اس کے اراکین کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اگر واقعی اس تنظیم کے ممبران غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں، تو ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے، مگر یہ یاد رہے کہ اسی طرح کی کارروائی ۲۰۰۱ء میں اس وقت کی مسلم نوجوانوں کی تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (سیمی) کے خلاف بھی کی گئی تھی۔ بہت سے الزامات جو آج پی ایف آئی پر لگائے جا رہے ہیں، کم و بیش ان ہی الزامات کا پٹارہ سیمی کے خلاف بھی کھولا گیا تھا۔ جن افراد نے بعد میں سیمی کے کارکنان کے مقدمات کی پیروی کی ہو یا جن صحافیوں نے عدالتی ٹریبونل، جو پابندی کی اپیل کی شنوائی کر رہا تھا، کی کارروائی کور کی ہے، ان کو معلوم ہوگا کہ کیسے بودے الزامات لگائے گئے تھے۔ مگر ان کے نتیجے میں کتنی زندگیاں تباہ و برباد ہوگئیں، اور سینکڑوں مسلم نوجوانوں کو جو معاشرہ میں مثبت کام کر سکتے تھے، برسوں جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے۔ آج ہی کی طرح اس وقت بھی ملی تنظیموں کو سانپ سونگھ گیا تھا اور وہ سیمی کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ امریکا میں ٹریڈ ٹاور کی تباہی اور القاعدہ کی کارروائی کے دو ہفتہ بعد یعنی ۲۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو سیمی پر جب پابندی لگائی گئی تھی، تو بتایا گیا کہ وہ بھارت میں خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتی تھی۔ پی ایف آئی پر بھی الزام ہے کہ ۲۰۴۰ء تک وہ ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے کے درپے تھی۔ یہ نظام تو مسلم اکثریتی والے ممالک لاگو نہیں کر پائے تو جس ملک کی ۸۰ فیصد آبادی غیر مسلم ہو، تو وہاں یہ نظام کیسے لاگو کیا جا سکتا ہے؟ بقول جید اسکالر ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، خواب دیکھنے پر کیسے پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ ایک جمہوری ملک میں جہاں حکومتوں یا نظام کو تبدیل کرنے کا پُرامن متبادل موجود ہے، بزور طاقت کسی نظریہ کو مسلط کرنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ حکومتوں کے لیے بھی لازم ہے کہ ہر نظریہ کے حامل افراد کو جوامن، سلامتی، استحکام، رواداری اور بھائی چارہ پر یقین رکھتے ہوں، اور پُرامن طور پر اپنے نظریات کی تبلیغ کا کام کرتے ہوں، کو یکساں مواقع اور حقوق فراہم کرے، تاکہ معاشرہ سے تشدد کا جواز ہی ختم ہو جائے۔

سیمی پر غداری، بغاوت، ملک دشمنی، پاکستان اور بنگلا دیش کے دہشت گردوں سے روابط، اسامہ بن لادن اور القاعدہ سے قریبی تعلق رکھنے، فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے اور فسادات برپا کرنے کے الزامات لگائے گئے تھے، جو کئی برسوں کی عدالتی کارروائی کے بعد اکثر ججوں نے مسترد کر دیے۔ دستاویزات کے مطابق ایک الزام یہ بھی تھا کہ سیمی اپنے کارکنوں کو تیرنے اور گھوڑ سواری کی تربیت دیتی تھی۔

ستمبر ۲۰۰۱ء کو جب سیمی کے صدر شاہد بدر فلاحی کو گرفتار کیا گیا، تو پولیس نے ایف آئی آر میں الزام لگایا کہ دس دن قبل دہلی سے ۵۰۰ کلومیٹر دور بہرائچ میں انہوں نے ایک گرلز کالج میں خطاب میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا کام کیا تھا۔ مگر جب تقریر کی ریکارڈنگ چلائی گئی، تو وہ جلسے میں موجود شرکاء کو تلقین کر رہے تھے۔ ''اچھے شہری بن کر اپنے والدین کو اپنے اوپر فخر کرنے کا موقع فراہم کردو''۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس تقریر میں امریکی پالیسی کو نشانہ بنایا تھا۔ جج نے پولیس کے گواہوں سے پوچھا کہ کیا اس تقریر کے بعد اس شہر میں کوئی فرقہ وارانہ واردات رونما ہوئی، تو ان کا جواب نفی میں تھا۔ یہ فاسٹ ٹریک کورٹ تھی۔ مگر اس قضیہ کو سلجھانے، اس تقریر کی ریکارڈنگ سننے اور گواہوں کی جرح کرنے میں اس کو پانچ سال لگے۔ اس کیس کو بگڑتے دیکھ کر اور جج کی طرف سے پھٹکار کے بعد حکومت نے اس کیس کو خود ہی واپس لینے کا فیصلہ کر دیا۔

ایک اور کیس میں فلاحی پر الزام تھا کہ جب ان کو دہلی کے جامعہ نگر علاقہ سے گرفتار کیا گیا تو ان کے دائیں ہاتھ میں ایک کلینڈر تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ کشمیر میں ہندو حکمرانوں نے ماضی میں مسلم رعایا پر ظلم کیے ہیں۔ پولیس نے اس کلینڈر کو لے کر ان پر ملک دشمنی، اور غداری کی دفعات کے تحت مقدمات درج کیے تھے۔ عدالتی کارروائی کے دوران جج نے سرکاری وکیل سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟ وکیل نے نفی میں جواب دیا۔ تو جج نے اس کو ایک ہفتے کا وقت دے کر کشمیر کی تاریخ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران گواہوں نے عدالت کو بتایا کہ کلینڈر کے کیس پر پولیس نے ان سے زبردستی دستخط لیے تھے اور وہ فلاحی کی گرفتاری کے وقت موجود بھی نہیں تھے۔ اسی طرح ایک اور کیس میں پولیس نے بتایا کہ سیمی کے صدر کی گرفتاری کے ایک ہفتے بعد ان کے دفتر سے کچھ آڈیو کیسٹ اور ایک بندوق کی تصویر ملی ہے۔ ایک اور کیس میں پولیس نے عدالت کو بتایا کہ ان کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دیواروں پر پوسٹر چپکاتے ہوئے پکڑا گیا، جس میں لکھا تھا کہ ''ان شاء اللہ ایک بار پھر بابری مسجد میں نماز ادا کی جائے گی''۔ جج نے خود ہی جرح کر کے سرکاری وکیل سے پوچھا کہ ''کیا یہ بیان یقین کرنے کے لائق ہے کہ ایک آل انڈیا تنظیم کا صدر، خود ہی گلی کوچوں میں پوسٹر چپکاتے ہوئے دکھائی دے؟'' ایک اور کیس میں ان پر الزام تھا کہ ۲۰۰۰ء میں انہوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر کلراج مشرا کی نکتہ چینی کی، جس نے سیمی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح سیمی کے جرنل میں انگریزی اخبار دی ایشین ایج میں شائع شدہ ایک مضمون کا ترجمہ شائع کرنے پر ان کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا الزام عائد کیا گیا۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ دی ایشین ایج پر بھی مقدمہ درج کیا جاتا، کیونکہ اصل مضمون تو اسی اخبار میں چھپا تھا۔ مگر ترجمہ پر کارروائی کی گئی۔ عدالت نے یہ سب الزامات خارج کر کے استغاثہ کو ہدایت کی کہ کیس صرف ان کے ممنوع تنظیم کے ساتھ وابستگی کا ہی چلایا جائے۔ مگر عدالت کے اس فیصلے کو آنے میں برسوں لگ گئے۔ سیمی پر کارروائی کے دوران متعدد نوجوانوں کے کیریئر تباہ ہوگئے۔ راجستھان کے پالی کے ایک اسپتال میں کام کرنے والے نوجوان مسلم ڈاکٹر کو پولیس نے گرفتار کر کے عدالت کو بتایا کہ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو جب سیمی پر پابندی عائد کی گئی، تو انہوں نے پالی میں لٹریچر اور پمفلٹ تقسیم کیے۔ مگر پولیس کو معلوم نہیں تھا کہ اس دن وہ ۴۰۰ کلومیٹر دور جسلمیر میں ملیریا کے مریضوں کے لیے منعقد کیمپ میں موجود تھے۔ ملیریا کیمپ کے رجسٹر نے پولیس کیس کی پول کھول کر رکھ دی۔ معلوم ہوا کہ پولیس نے پہلے ہی سے کیس تیار کر کے رکھا ہوا تھا کہ وہ رہا ہوگئے، مگر حکومت نے ان کو نوکری سے بے دخل کر دیا۔ ان کو کرایہ کے لیے مکان ملنا مشکل ہوگیا۔ حیدرآباد کے ۲۲ سالہ محتشم باللہ دکن کالج میں انجینئرنگ کے تیسرے سال کا طالب علم تھا کہ بار بار گرفتاری اور ٹارچر کی وجہ سے اس کو تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔

اس کو سب سے پہلے ۲۰۰۱ء میں ۱۵ سال کی عمر میں گرفتار کیا گیا تھا، جب اس نے حیدرآباد میں امریکا کے خلاف

مظاہرہ میں شرکت کی تھی۔ یہ کیس سات سال تک عدالتی غلام گردشوں میں گھومتا رہا۔ ۲۰۰۴ء میں گجرات پولیس نے حیدرآباد آ کر محتشم کے پڑوسی مولانا نصیرالدین کو ریاستی وزیر داخلہ ہرین پانڈے کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس پر کئی افراد نے پولیس اسٹیشن کے سامنے احتجاج کیا۔ گجرات پولیس افسر نے فائرنگ کر کے موقع پر محتشم کے بڑے بھائی کو ہلاک کر دیا۔ جبکہ اس بھیڑ کو ڈانٹ پھٹکار سے یا حیدرآباد پولیس کے ذریعے معمولی لاٹھی چارج سے بھگایا جا سکتا تھا۔ بجائے ہمدردی دکھانے کے محتشم پر کارسرکار میں مداخلت کا مقدمہ درج کیا گیا۔ جب اس کیس سے فراغت ملی تو ۲۰۰۸ء میں ان کو شہر میں ایک سال قبل ہوئے بم دھماکوں میں ملزم بنا کر گرفتار کیا گیا۔ تشدد اور الیکٹرک شاک دے کر بھی جب یہ کیس ٹک نہیں پایا، تو بتایا گیا کہ محتشم نے قبرستان میں ایک خفیہ میٹنگ میں شرکت کی تھی، جس میں فرقہ وارانہ فساد کرنے کی سازش رچی گئی تھی۔ رہائی کے بعد جون ۲۰۰۸ء میں محتشم نے ہفت روزہ ''تہلکہ'' میگزین کو بتایا کہ پولیس بس مسلم نوجوانوں کو جیلوں کے اندر رکھنا چاہتی ہے۔

۲۰۰۸ء میں بھوپال سے ۱۵۰ کلومیٹر دور نرسنگھ گڑھ میں ایک فوٹو اسٹوڈیو کے مالک تبریز حسین، اس کے دو بھائیوں آفتاب اور انتخاب اور شاکر علی اور اس کے بھائی عرفان علی کو گرفتار کر کے بتایا گیا کہ ان کے پاس سے پوسٹر اور پمفلٹ برآمد ہوئے، جن میں بابری مسجد کو دوبارہ بنانے کا ذکر تھا۔ عرفان علی، ماجد علی کو بھی بعد میں اسی کیس میں گرفتار کیا گیا اور ان سبھی کے خلاف بغاوت کی دفعات کے تحت مقدمات درج کیے گئے۔ سیمی کے خلاف درج کیسز میں پولیس شاید اکیلے یسین پٹیل کو ہی انسدادِ دہشت گردی کے قانون POTA میں سیشن عدالت کے ذریعے پانچ سال تک سزا دلوا سکی۔ ان کے خلاف دائر فرد جرم میں بتایا گیا کہ وہ دن کے ڈیڑھ بجے پوسٹر چپکا رہے تھے۔ جس میں ایک بند مٹھی کے ساتھ امریکا، روس، برطانیہ اور فرانس کے جھنڈے بنائے گئے تھے۔ اس میں اقوام متحدہ کو ان ممالک کی لونڈی سے تشبیہ دی گئی تھی۔ یہ کیس دہلی میں شیونارائین ڈھنگرہ کی عدالت میں چل رہا تھا اور کارروائی کے دوران جج صاحب خود ہی وکیل استغاثہ کا رول ادا کر رہے تھے۔ وکیل دفاع نے جب پولیس سے پوچھا کہ بھری دوپہر کو اگر آپ نے ان کو پوسٹر چپکاتے ہوئے پکڑا، اس پوسٹر میں ایسی کیا بات ہے کہ یسین پٹیل کے خلاف انسدادِ دہشت گردی کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے؟ جج صاحب نے کہا کہ یہ پوسٹر تو AK-47 سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جب اسٹینوگرافر لکھاتے ہوئے، جج صاحب نے ایک جملہ غلط لکھوایا اور اس کی تصحیح کرنے کی پٹیل نے کوشش کی، تو جج نے وکیل دفاع کی طرف رخ کر کے کہا کہ ''اپنے موکل سے کہو، کہ اپنی زبان پر قابو رکھے ورنہ اس کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا''۔

تامل ناڈو کے جواہر اللہ کی تنظیم تامل ناڈو منترا کھاز گم، جو صوبہ کی ایک اہم سماجی تنظیم ہے، کے متعلق بتایا گیا کہ یہ سیمی کا ایک فرنٹ ہے۔ ٹریبونل میں جواہر اللہ نے بتایا کہ وہ ۱۹۸۹ء تک سیمی سے وابستہ تھے اور اس کے بعد ان کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ان کے دَور تک تو یہ ایک قانونی تنظیم تھی۔ سرکاری وکیل نے ٹریبونل میں ایک کاغذ پیش کر کے کہا کہ جواہر اللہ نے ایک مسجد کی انتظامیہ کمیٹی سے ایک کمرہ کرایہ پر لیا تھا، جو سیمی کا دفتر ہے اور ابھی تک اس کا کرایہ وہی ادا کرتے ہیں۔ جب جج نے اس کاغذ کو دیکھنے کے لیے کہا تو معلوم ہوا کہ اس پر جواہر اللہ کے دستخط ہی نہیں تھے۔ جج نے تنبیہ کے ساتھ اس کاغذ کو پھینک دیا۔

۲۰۰۶ء میں کیرالا کے کوٹایم شہر کے نواح میں یوم آزادی کی تقریب میں عبدالرزاق مدعو تھے۔ ان کی تقریر کا موضوع ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' تھا۔ مگر تقریر کے بعد ان کو گرفتار کیا گیا، کیونکہ پولیس نے بتایا کہ وہ سیمی کے رکن ہیں اور تقریر میں انہوں نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا کام کیا ہے۔

۲۰۱۲ء میں جب دہلی میں عدالتی ٹریبونل میں سیمی پر پابندی سے متعلق سماعت شروع ہوئی، تو ایڈوکیٹ اشوک اگروال اور مرحوم ایڈوکیٹ سالار محمد خان کے اصرار پر میں نے بطور صحافی کئی ماہ تک چلنے والی اس کارروائی کو کور کیا۔ ویسے تب تک میرا بھی یہی خیال تھا سیمی کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ حکومت تو بالکل یونہی جھوٹ تو نہیں بول رہی ہوگی۔ مگر اس سماعت کے دوران تو کئی ہوشربا انکشافات سامنے آئے۔ دہلی ہائی کورٹ کے جج جسٹس وی کے شالی کی صدارت والا یہ ٹریبونل سیمی پر عائد پابندی کو برقرار رکھنے کے جواز پر ساتویں مرتبہ سماعت کر رہا تھا۔ کارروائی کے دوران مہاراشٹر کے شولا پور میں وجے پور ناکہ کے انسپکٹر شیواجی تامبرے نے ایک حلف نامہ دائر کیا تھا، جس میں بتایا گیا کہ سیمی کے کچھ مبینہ کارکنوں کے گھروں پر جب انہوں نے چھاپے مارے تو وہاں سے اُردو میں لال روشنائی سے تحریر کردہ ایک دستاویز ملا، جس پر ایک شعر درج تھا:

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

غالبؔ کے اس شعر کا انسپکٹر تامبرے نے مراٹھی ترجمہ کچھ یوں کیا تھا ''رکتچی لات دو کیا پسن کا جینا' متراچیہ امبراتھیاپسون اتھن کا جینا''۔ انسپکٹر تامبرے نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ یہ شعر ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔ ایک اور حلف نامہ میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ سیمی مہاراشٹر کو ملک سے الگ کرنے کی سازش کر رہی ہے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز حیدرآباد کے سعید آباد تھانے کے انسپکٹر پی دیویندر کا حلف نامہ تھا۔ جن کا اصرار ہے کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی سیمی کی ایک ذیلی تنظیم ہے۔ دیویندر کا کہنا تھا کہ سیمی اتنی خطرناک تنظیم ہے کہ لشکر طیبہ جیسی تنظیمیں بھی اسی کے تحت کام کرتی ہیں۔ جب وکیل دفاع نے ان سے پوچھا کہ آئی ایس آئی سے ان کی کیا مراد ہے تو انہوں نے سینہ ٹھونک کر کہا کہ، میں اپنے اس بیان پر قائم ہوں کہ پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی دراصل سیمی کے اشاروں پر ہی کام کرتی ہے۔ گھاٹ کوپر تھانہ ممبئی کے اس وقت کے تفتیشی افسر ادے سنگھ راٹھور نے اپنے حلف نامے میں لکھا کہ سیمی کے مبینہ کارکن شبیر احمد مسیح اللہ (مالیگاؤں) اور نفیس احمد انصاری (ممبئی) واضح طور مہاراشٹر کو ملک سے الگ کرنے کی سازش میں ملوث پائے گئے ہیں۔ انسپکٹر کے مطابق ان لوگوں کے پاس سے جو قابل اعتراض مواد برآمد ہوئے تھے وہ سرورق کے بغیر اردو کا ایک رسالہ ہے۔ یہ رسالہ دہلی کی سرکاری اردو اکادمی کا 'ماہنامہ امنگ' تھا۔ جسے اکادمی بچوں کے لیے شائع کرتی ہے۔ جب راٹھور سے جرح کی گئی تو انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ اس رسالہ میں بچوں کے لیے مضامین اور کہانیاں ہیں لیکن ان کا اصرار تھا کہ ایسے ہی رسائل کے ذریعہ انتہاپسند اپنے خیالات' افکار و نظریات دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور حلف نامے میں کھنڈالہ پولیس ٹریننگ اسکول کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ وشنو بابو راو جگ تاپ کہتے ہیں کہ جب وہ شولا پور کے صدر بازار تھانے میں انسپکٹر تھے تو تفتیش سے ان کو معلوم ہوا کہ سیمی کا حتمی مقصد ملک میں اسلامی تعلیم کو پھیلانا ہے۔ جس کے لیے وہ انفاق، سریہ اور جہاد کا سہارا لے رہے ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ 'سریہ' کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا کیا مطلب ہے تو جگ تاپ نے کہا کہ سریہ اردو یا فارسی کا لفظ ہے۔ ان عجیب و غریب حلف ناموں اور جرح کے دوران پولیس افسران کے بیانات سے کبھی کبھی تو جج صاحب بھی ان پر برس پڑتے تھے، مگر جب فیصلے کی گھڑی آئی تو انہوں نے پابندی برقرار رکھی۔

صرف ۲۰۰۸ء میں دہلی ہائی کورٹ کی جج گیتا متل کی صدارت میں جب ٹریبونل بنا، تو اس نے جرأت دکھا کر سیمی پر لگائی گئی پابندی کو خارج کر کے کہا کہ ایسے ناکافی ثبوتوں کی موجودگی میں پابندی کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ابھی ٹریبونل نے اوپن کورٹ میں حکم نامہ سنایا ہی نہیں تھا کہ وزارت داخلہ کی ایما پر ایڈیشنل سولیسٹر جنرل گوپال سبرامنیم نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے جی بالاکرشنن کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اس فیصلہ کو ۲۴ گھنٹوں کے اندر ہی اسٹے کروا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سیمی کی طرف سے دائر کئی اپیلیں کئی دہائیوں سے عدالت عظمیٰ کی کارروائی کی منتظر ہیں۔ اگر یہ انصاف ہے تو ظلم اور ناانصافی کسے کہتے ہیں؟ اندیشہ ہے کہ یہی ڈرامہ دوبارہ کھیلا جا رہا ہے۔ ۲۰۰۰ء کی نوجوان نسل کو ٹھکانے لگایا گیا، ان کے کیریئر برباد کر دیے گئے اور اب نشانہ سن ۲۰۲۲ء کی نوجوان مسلم نسل ہے۔ جب بھی پی ایف آئی کی پابندی کی توثیق کے لیے ٹریبونل کی تشکیل ہوگی، تو صحافیوں اور ملی تنظیموں پر لازم ہے کہ اس پر نگاہ رکھیں اور دیکھیں کہ حکومت کس طرح کے ثبوت اس کے سامنے پیش کرے گی۔ ویسے تو پچھلے کئی برسوں سے ملی تنظیموں خاص طور پر جمعیت علماء ہند اور جماعت اسلامی نے فعال کردار نبھاتے ہوئے متعدد افراد کو قانونی چارہ جوئی فراہم کی، جس سے اکثر افراد اعلیٰ عدالتوں سے بری ہو گئے، کیونکہ ان کیسوں کی اساس ہی جھوٹ پر مبنی تھی۔ ان تنظیموں کی نوجوانوں کے خلاف کئی شکایات ہوں گی۔ شہریت قانون پر ہوئی ملک گیر ایجی ٹیشن میں ان کو اسپیس نہیں دی گئی۔ مگر اس کے لیے ان کو اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھنا ہوگا۔ اس وقت ان تنظیموں پر لازم ہے کہ موجودہ کیسز کی پیروی کر کے ان نوجوانوں کو نفرت کی سیاست کی بھینٹ چڑھنے سے روکنے کا کام کریں۔ ورنہ شاید تاریخ ان کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور وہ ۱۹۴۶ء میں مارٹین نیمولر کی لکھی گئی نظم کی عملی تصویر بن جائیں گے۔۔

پہلے وہ سوشلسٹوں کو لینے آئے، میں بول نہیں سکا،
کیونکہ میں سوشلسٹ نہیں تھا،
پھر وہ ٹریڈ یونین والوں کے لیے آئے، میں نہیں بولا،
کیونکہ میں ٹریڈ یونینسٹ نہیں تھا،
پھر وہ یہودیوں کو لینے آئے، میں پھر بھی نہیں بولا،
کیونکہ میں یہودی نہیں تھا،
پھر وہ مجھے لینے آئے اور بولنے کے لیے کوئی بچا نہیں تھا۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۶ر اکتوبر ۲۰۲۲ء)

نو ہندتو

یعنی اصل دھارا سے مختلف، ہندتو کے کچھ اہم فکری و عملی دھارے

گزشتہ سے پیوستہ

سید سعادت اللہ حسینی

متشدد ہندو تحریکات

ان افکار نے کئی ایسی ہندو تحریکات کو بھی جنم دیا ہے جو انتہائی متشدد ہیں۔ پر تشدد بلکہ دہشت گرد کارروائیوں میں شمولیت کے بھی ان پر الزامات لگتے رہے ہیں۔ ایسی چھوٹی بڑی تحریکیں ملک کے مختلف حصوں میں کام کر رہی ہیں۔

سناتن سنستھا ملک کے مغربی علاقوں میں سرگرم تنظیم ہے۔ اس کو ایک نفسیاتی معالج اور ہپنوٹسٹ ڈاکٹر جینت اٹھاولے نے قائم کیا تھا اور گوا کے ایک گاؤں رام ناتھی میں اس کا صدر مقام اور آشرم ہے۔ کرم یوگا، گیان یوگا اور بھکتی یوگا جیسے سناتنی روحانی طریقوں کو جمع کر کے اٹھاولے نے اپنا مخصوص راستہ 'روکر پا یوگا' تشکیل دیا ہے۔ آشرم میں بھکتوں کو روحانی ترقی کے نمبر دیے جاتے ہیں۔ ۷۰ سے جب نمبر تجاوز کرتے ہیں تو 'سنت' کا درجہ ملتا ہے اور ۱۰۰ ر پر موکشا کا۔ ان 'روحانی تصورات' اور اپنے مخصوص ہپناٹزم سے وہ اپنے پیروؤں کو مسحور کر کے رکھتے ہیں۔ سنستھا سے وابستہ افراد پر تھانے، واشی وغیرہ کے بم دھماکوں کے الزامات لگے اور بعض عدالتوں میں یہ الزامات ثابت بھی ہوئے۔ کمیونسٹ قائد اور مصنف گوئند پنسارے، نریندر ڈابھولکر، اور گوری لنکیش وغیرہ کے قتل کے الزامات بھی اس تنظیم کے ارکان پر ہیں۔ جنسی آوارگیوں اور منشیات کے استعمال کے معاملات بھی ان سے وابستہ رہے ہیں۔ بی جے پی سمیت متعدد سیاسی جماعتوں کے رہ نماؤں نے اس تنظیم پر پابندی کے مطالبات کیے ہیں۔

کرناٹک میں پرمود متالک کی شری رام سینا اکثر خبروں میں رہتی ہے۔ ویدک دھرم کی حفاظت اور ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ وغیرہ جیسے مقاصد کے ساتھ وہ خاص طور پر ویلنٹائن ڈے کی جارح مخالفت کے لیے جانے جاتے ہیں۔ مسجدوں پر دعویداری، 'لو جہاد' کے نام پر ہراسانی، وغیرہ ان کی کچھ اور سرگرمیاں ہیں۔ دہشت گرد سرگرمیوں کی چارج شیٹوں میں ان کا بھی ذکر موجود ہے۔ اسی نام سے ایک تنظیم بہار میں بھی اسی طرح کے مقاصد کے لیے سرگرم ہے۔

ہندو جن جاگرن سمیتی کا صدر دفتر بھی گوا میں ہے۔ اس کا مقصد ہندو راشٹر کا قیام لکھا گیا ہے۔ ایم ایف حسین پر بننے والی فلم کے خلاف احتجاج سے یہ مشہور ہوئے اور وقتاً فوقتاً اس طرح کے مسائل پر احتجاجی مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔ چند ماہ قبل اسی تنظیم کے عہدے دار نے مسلمان پھل فروشوں اور ترکاری فروشوں کے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی۔

ہندو یوا واہنی، اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی ادتیا ناتھ کی قائم کردہ تنظیم ہے۔ تنظیم کا مقصد ہندو سماج کا اتحاد اور اس کے مفادات کا تحفظ لکھا گیا ہے لیکن اس کی سرگرمیاں زیادہ تر ''لو جہاد کے روک تھام''، ''گایوں کی حفاظت'' اور ''گھر واپسی کی تحریک'' جیسے کاموں کو محیط ہوتی ہیں۔

بعض نیوز پورٹلوں اور ویب سائٹس کو بھی اس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اوپ انڈیا (OpIndia) ایک نیوز پورٹل ہے جو جھوٹی خبروں کے لیے بدنام ہے۔ انٹرنیشنل فیکٹ چیکنگ نیٹ ورک (IFCN) نے اس کی پچیس سے زیادہ اسٹوریوں کو صریح جھوٹ اور ۱۴ر اسٹوریوں کو غلط رپورٹنگ پر مبنی قرار دیا تھا۔ جھوٹی خبروں کے ذریعے نفرت پھیلانا، مخالفین کی کردار کشی کرنا، مخالف صحافیوں کا تعاقب کرنا وغیرہ اس کی اہم سرگرمیاں ہیں۔ کووڈ لاک ڈاؤن کے دوران اس نے یہ جھوٹی خبر پھیلانے کی کوشش کی تھی کہ ''بہار میں ایک مسجد میں ایک ہندو لڑکے کی قربانی دی گئی ہے'' اور یہ کہ ''مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مسجد میں ہندو کی قربانی دینے سے مسجد طاقتور ہوتی ہے اور اس کا اثر بڑھتا ہے۔'' اسی طرح کا ایک پورٹل سوراجیہ میاگ (swarajyamag.com) ہے۔

ان باقاعدہ نیوز پورٹلوں کے ساتھ سوشل میڈیا پر ایک پوری فوج ہے جو اس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

نرم ہندتو

نرم ہندتو سے مراد اسلام دشمنی یا مسلم دشمنی کے واضح اعلان کے بغیر ہندوتو کے کاز کی نظریاتی، تہذیبی اور سیاسی خدمت ہے۔ اس محاذ پر سب سے موثر سرگرمی علمی و تحقیقی اداروں یا تھنک ٹینکوں کی ہے۔ ملک میں پالیسی ریسرچ کے اداروں کے رواج سے کافی پہلے، یعنی تقریباً نصف صدی پہلے، نانا جی دیشمکھ نے دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا

تھا۔ گجرات کے فسادات کے بعد انڈیا فرسٹ فاؤنڈیشن اور امیج انڈیا فاؤنڈیشن جیسے ادارے قائم کیے گئے۔ پینی سلوانیا یونیورسٹی کی ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت امریکا اور چین کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ تھنک ٹینک ہندوستان میں ہیں اور ۲۰۱۴ء میں بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے ۲۰۲۰ء تک اس تعداد میں تین گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ویویکانند انٹرنیشنل فاؤنڈیشن، دلی کے نہایت اہم علاقے، چانکیہ پوری میں نرسمہاراؤ حکومت کی عطا کردہ زمین پر قائم ایک معروف تھنک ٹینک ہے۔ پینی سلوانیا کی مذکورہ رپورٹ میں اس ادارے کو دنیا کے اہم ترین تھنک ٹینکوں میں شمار کیا گیا ہے۔ کانگریس کے بعض قائدین کا الزام ہے کہ اسی ادارے نے رشوت کے خلاف مہم کی منصوبہ بندی کر کے یو پی اے حکومت کو ختم کرنے کا مکمل منصوبہ تشکیل دیا تھا۔ انڈیا فاؤنڈیشن، شیاما پرساد مکرجی فاؤنڈیشن وغیرہ ادارے بھی دنیا کے اہم تھنک ٹینک مانے گئے ہیں۔ گروپ آف انٹیلیکچولس اینڈ اکیڈمیشینس (GIA)، دلی کے یونیورسٹی اساتذہ، وکلا اور صحافیوں کا ایک سرگرم گروپ ہے۔ دلی فسادات کے بعد اس نے ایک مخصوص زاویے سے ان فسادات کا تجزیہ کرتے ہوئے رپورٹ شائع کی تھی۔

یہ ادارے ایک طرف بی جے پی اور آر ایس ایس کی پالیسی سازی میں سرگرم تعاون کرتے ہیں اور دوسری طرف شائستہ علمی زبان میں اس کی پالیسیوں اور موقف کو دنیا کے لیے قابل قبول بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کتابوں اور کتابچوں کی وسیع اشاعت، کانفرنسوں، علمی محفلوں وغیرہ کا انعقاد، کلچرل فیسٹیول، بک فیسٹیول وغیرہ کا اہتمام، اخبارات میں مضامین کی اشاعت، ٹی وی پروگراموں میں شرکت، لیکچر سیریز کا اہتمام، ملک و بیرون ملک کی اہم یونیورسٹیوں میں علمی محفلوں کا انعقاد، ان سب ذرائع سے وہ اعلیٰ سطحوں پر رائے عامہ کی ہمواری کا کام کرتے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ یہ ادارے مباحثے کے حدود پر اتفاق رائے پیدا کر دیتے ہیں یعنی یہ کہ کن باتوں پر مباحثہ ہوسکتا ہے اور کون سی باتیں مباحثے سے ماورا ہیں؟ گویا مباحثے کی ایک مخصوص ریخ اس طرح عام کر دیتے ہیں کہ اس کے باہر کسی خیال کی پیشکش آسان نہیں رہتی۔

اب مغربی دنیا میں بھی ایسے ادارے وجود میں لائے جا رہے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی آف امریکا، فلوریڈا میں وسیع کیمپس پر پھیلی ہوئی یونیورسٹی ہے اور ہندو فلسفہ، یوگا، سنسکرت، جیوتش وغیرہ کی تعلیم دیتی ہے۔ یونیورسٹی کی ویب سائٹ کے مطابق طلبہ کی تعداد آٹھ ہزار سے متجاوز ہے۔ دھرما سولائزیشن فاؤنڈیشن کیلی فورنیا سے کام کرنے والی ایک تنظیم ہے۔ یہ تنظیم امریکی یونیورسٹیوں میں اکیڈمک چیئر قائم کرتی ہے، وزٹنگ پروفیسرشپ اسپانسر کرتی ہے، خصوصی سینٹر قائم کراتی ہے، طلبہ کو اور ریسرچ کو اسپانسر کراتی ہے اور اپنے مخصوص تصورات کو مغرب کی علمی دنیا میں رائج کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر علمی حلقوں میں جو لوگ ہندتو کی مخالفت کرتے ہیں ان کے خلاف عوامی مہم، قانونی کارروائیاں اور دباؤ کے ذریعے ان کے کاموں کو روکنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ ہندوستانیات (Indology) کے شعبے، مغربی دنیا کی متعدد یونیورسٹیوں میں برسوں سے کام کر رہے ہیں۔ اب ان سب پر ان تنظیموں کے ذریعے اثر انداز ہونے کی نہایت منظم کوششیں ہو رہی ہیں۔

نرم ہندتو کا دوسرا اہم محاذ عالمی تنظیمیں ہیں۔ تعلیمی محاذ پر جو عالمی تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان کا جائزہ ہم اپنے سابقہ مضمون میں لے چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مذہب، کلچر، فنون لطیفہ، ایڈوکیسی، وغیرہ محاذوں پر متعدد تنظیمیں ہیں جو دنیا کے مختلف ملکوں میں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے وسیع اور قدیم غالباً ہندو سیوک سنگھ ہے جو ۷۵ سال پہلے کینیا میں قائم ہوئی تھی اور اب ۱۵۶ ملکوں میں ساڑھے تین ہزار شاخوں کے ذریعے کام کر رہی ہے۔ کینیا، لائبیریا، برطانیہ، امریکا سمیت دیگر متعدد افریقی اور یورپی ممالک میں سرگرم ہے اور ان ملکوں میں موجود ہندوؤں کو متحد کرنے کے علاوہ ہندتو کے فکر کی توسیع اور اپنے اپنے ملکوں میں ہندتو کاز کے لیے لابنگ کا کام کرتی ہے۔ وشو ہندو پریشد اور اس کی طلبہ تنظیم ہندو اسٹوڈنٹس کونسل بھی کئی ملکوں میں فعال ہے۔ ہندو امریکن فاؤنڈیشن، امریکا میں سرگرم ایڈووکیسی گروپ ہے جو ہندوؤں کے حقوق کے لیے کام کرتا ہے۔ سنگھ کے افکار یا پالیسیوں کے خلاف جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان پر ہتک عزت کے مقدمات قائم کرنا اس کی ایک اہم سرگرمی ہے۔ سیوا انٹرنیشنل ایک رفاہی تنظیم ہے جو ۲۰ ملکوں میں کام کر رہی ہے۔ انڈیا ڈیولپمنٹ اینڈ ریلیف فنڈ، امریکا میں ہندوستان کے مسائل کے لیے کام کرنے والی رفاہی تنظیم ہے۔ بظاہر یہ رجسٹرڈ رفاہی تنظیمیں ہیں لیکن اصلاً یہ بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کو ہندتو کے نظام فکر سے جوڑتی اور ہندوستان کے اندر جاری ہندتو سرگرمیوں کو فنڈ فراہم کرتی ہیں، امریکی حکومتوں اور پرائیویٹ اداروں کے نصاب تعلیم اور درسیات پر اثر انداز ہوتی ہیں اور سب سے اہم یہ کہ مختلف مغربی ملکوں کے بااثر سیاست دانوں سے ربط، ان کی مالی امداد، اور مسلسل لابنگ کے ذریعے قانون سازی، پالیسی سازی اور فیصلہ سازی کو متاثر کرتی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ان کاموں کے لیے صرف امریکا میں ان تنظیموں نے ۱۶ کروڑ امریکی ڈالر (تقریباً ساڑھے بارہ سو کروڑ روپے) خرچ کیے ہیں۔ اسی سے مماثل سرگرمیاں آسٹریلیا، برطانیہ اور متعدد یورپی ملکوں میں بھی جاری ہیں۔

حالیہ دنوں میں بہت سی 'روحانی' تحریکیں اور یوگا، آیورویدا وغیرہ بھی سافٹ ہندتو کے فروغ کا ایک اہم پلیٹ فارم بن کر ابھرے ہیں۔ ملک کے باہر اور خصوصاً مغربی دنیا میں یوگا کی مقبولیت کوئی نیا ڈیولپمنٹ نہیں ہے۔ دنیا بھر میں یوگا کے نام پر مختلف ورزشوں کا کم سے کم گذشتہ پچاس برسوں سے دنیا میں عام رواج رہا ہے۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ یوگا کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کو ماننے والوں کا خیال یہ ہے کہ یہ قدیم ہندو مذہبی کتابوں سے ماخوذ، جسمانی، روحانی اور ذہنی صحت کا مکمل طریقہ ہے جو ہندو فلسفہ حیات پر مبنی ہے۔ اسے برہمنی یوگا بھی کہتے ہیں اور اس کا اہم ماخذ پتنجلی کے سوتر ہیں۔ اس یوگا کا اصل مقصد شعور کی توسیع، روشنی و بصیرت کا حصول اور نتیجتاً 'حقیقت مطلق' سے مکمل اتحاد ہے یعنی اس یوگا کا اصل زور روحانی مقاصد پر ہے۔ جسمانی مشقیں اس کا محض ایک ذیلی حصہ ہیں، جس کا مقصد جسم کو بھی اسی مقصد یعنی روحانی ترقی کے لیے تیار کرنا ہے۔ یوگا کی دوسری قسم جدید یوگا ہے جو قدیم روایات کی ترقی یافتہ، تخفیف شدہ اور اصلاح یافتہ جدید شکل ہے اور ایک قسم کی جسمانی ورزش یا جمناسٹک ہے جس کا عقیدے اور فلسفہ حیات سے اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس کا مقصد جسمانی صحت، پھیپھڑوں اور آکسیجن اور خون کے راستوں میں کشادگی، اعضا میں لچک وغیرہ ہے۔ مغربی دنیا میں یوگا کی یہی دوسری شکل مقبول ہے۔ اسے پوسچرل یا اینگلوفون یوگا (postural or anglophone yoga) بھی کہتے ہیں۔ یوگا کی یہ شکل ہندوستان سے نکل کر زمانہ قدیم ہی سے چین و جاپان، ایران وغیرہ میں مقبول و معروف رہی ہے اور دیگر مقامی طریقوں سے مل کر طرح طرح کی شکلیں اختیار کی ہیں۔ حالیہ دنوں میں جسمانی صحت اور فٹنس کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی حساسیت کی وجہ سے اسے دنیا بھر میں بڑی مقبولیت ملی۔ اس کا نام یوگا ضرور باقی رہا لیکن اس میں جسمانی تندرستی کے مختلف قدیم و جدید طریقوں کی آمیزش ہوتی رہی اور

سیکڑوں قسمیں دنیا کے مختلف گوشوں میں وجود میں آئیں۔ ہمارے ملک کے شہری علاقوں میں دونوں طرح کے یوگا رائج ہیں۔ جہاں روایتی پنڈت وغیرہ روحانی یوگا کو فروغ دیتے ہیں وہیں جدید ورزش گاہوں اور فٹنس کے مراکز میں پوسچرل یوگا کی مشق کرائی جاتی ہے۔

ہندتو کے حاملین اس صورت حال کو اپنے مخصوص مذہبی و تہذیبی تصورات اور مخصوص برہمنی روایات کے احیا کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ یوگا کی پہلی شکل یعنی مخصوص فلسفیانہ اور روحانی اپروچ کو مقبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اسے ادویتا (وجود کی وحدت) ویدانت کے فلسفے کے مطابق انسانوں کی نجات کے ایک طریقے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ انسان کی روح اپنے جسم سے، باقی بنی نوع انسان سے، کائنات اور اس کے وسائل سے، اور 'واحد الوہی وجود' سے اس طرح ہم آہنگ ہوجائے کہ مصنوعی دوئی ختم ہوجائے اور بالآخر وہ اس خدائی وجود میں مکمل ضم ہوجائے۔ وہ اس یوگا کو ہی اصل یوگا قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات کس قسم کا یوگا فروغ دے رہے ہیں اس کا اندازہ وزیر اعظم نریندر مودی کی ذاتی ویب سائٹ پر موجود ان کے اقوال سے ہوتا ہے۔ مثلاً:

''یوگا نفسیاتی صحت (wellness) کو بھی یقینی بناتا ہے اور جسمانی صحت (fitness) کو بھی۔۔۔ یوگا محض ایک جسمانی ورزش نہیں ہے بلکہ جسمانی، ذہنی اور روحانی طمانیت کے حصول کا ذریعہ ہے۔۔۔ یوگا گیان (علم) کرما (اچھے اعمال) اور بھکتی (عبادت) کے امتزاج کا نام ہے۔۔۔ یوگا (ایک عظیم) روحانی سفر میں داخلے کا دروازہ ہے''۔

اس وقت مضامین، مقالوں اور کانفرنسوں کے ذریعے، کارپوریٹ تشہیر کے طاقت ور ذرائع اور کارپوریٹ ٹریننگ کو استعمال کرکے، سرکاری دفاتر اور اسکولوں میں لزوم کے طریقوں کا استعمال کرکے اور عالمی سطح پر مارکیٹنگ کے ترقی یافتہ وسائل کو بروئے کار لاکر، یوگا کی اسی فلسفیانہ و روحانی اپروچ کو مقبول بنانے کی کوشش ہورہی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ آئندہ بتدریج روایتی یوگا کے دیگر روحانی طریقوں کو بھی عام کیا جائے گا۔

یہی معاملہ مختلف 'روحانی طریقوں' کا ہے۔ شری شری روی شنکر (آرٹ آف لیونگ فاؤنڈیشن، پ: ۱۹۵۶ء)، سد گرو (آشرم: ایشا فاؤنڈیشن کوئمبٹور، پ: ۱۹۵۷ء)، ماتا امریتا نندامائی (آشرم: کولم کیرلہ، پ: ۱۹۵۳ء)، وغیرہ نے قدیم ہندو فلسفوں کو جدید انسان کی نفسیاتی الجھنوں سے جوڑ کر اپنے اپنے روحانی طریقے ایجاد کیے ہیں۔ تناؤ سے نجات، پرسکون زندگی، اپنے کام اور مقاصد پر بہتر ارتکاز، منفی خیالات اور سوچ سے بچاؤ، زندگی کی بہتر منصوبہ بندی، لوگوں سے اچھے تعلقات اور ان کے دلوں کو جیتنے کی صلاحیت، خود اعتمادی، مشکلات اور چیلنجوں سے مقابلے کا فن وغیرہ جیسے جاذب عنوانات سے وہ کشش پیدا کرتے ہیں اور بظاہر سیکولر اصطلاحات اور زبان کے ذریعے نہایت لطیف و سبک انداز میں برہمنی فلسفیانہ و روحانی افکار ذہن نشین کراتے ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ ادب، فنون لطیفہ اور دیگر تہذیبی ذرائع کا ہے۔ ان کا جائزہ خود ایک تفصیلی مضمون کا متقاضی ہے۔

حاصلِ بحث

☆ اس بحث سے پھر ایک بار ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ہندتو کے حاملین سب کے سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ یہ مختلف خیالات کا ایک وسیع سلسلہ (spectrum) ہے جس کا نقطہ اشتراک قدیم ہندو روایات کی بالاتری کا احساس اور مقابل کی مذہبی و تہذیبی قوتوں سے، بالخصوص عیسائیت اور اسلام سے رقابت کا جذبہ ہے۔ لیکن اس وسیع سلسلے میں رقابت کی شدت کے اعتبار سے مختلف عناصر کے مختلف درجات ہیں۔ ایک انتہا پر وہ شدت پسند ہیں جن کا اوپر ہم نے متشدد گروہوں کے عنوان سے اور وائس آف انڈیا تحریک کے عنوان سے جائزہ لیا ہے اور دوسری طرف درمیان سے قدرے دائیں کو جھکے ہوئے (Right centre) وہ عناصر بھی ہیں جو محض ہندو روایات اور ہندو مفادات کو ترجیح دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت جو عناصر بی جے پی جیسی جماعتوں کے ساتھ ہیں ان میں بھی یہ سارے طبقات شامل ہیں۔ اگرچہ آر ایس ایس بظاہر وائس آف انڈیا تحریک اور اس کے نظریات کی مخالف ہے لیکن اس کے حامی عوام میں بلکہ ان کے کیڈر میں بھی اس تحریک کے نظریات سے ہم دردی و اتفاق رکھنے والے بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ وائس آف انڈیا کے ایک مصنف آر ایس ایس کے ایک دانش ور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آر ایس ایس کی تنظیمی درجہ بندی میں ڈاکٹر شری رنگ گڈبولے محض ایک سیوم سیوک ہیں۔ کاش کہ وہ سرسنگھ چالک یا سرکاریا وہا ہوتے کیوں کہ نظریاتی صراحت، تاریخی شعور، قومی مسائل کے فہم، اور فکری بیدار مغزی کا جو مظاہرہ ان کے مضامین سے ہوتا ہے، افسوس کی بات ہے کہ وہ سنگھ کی اعلیٰ قیادت میں مفقود ہے''۔

وائس آف انڈیا کے کسی مصنف کا کسی کے نظریات کی ایسی تعریف کرنے کا مطلب یہی ہے کہ ممدوح اس کے نظریات سے ہم آہنگ اور اسی کی طرح شدت پسند ہے۔ اسی طرح دوسری جانب وہ قدرے اعتدال پسند لوگ بھی موجود ہیں جو آر ایس ایس اور بی جے پی کی پالیسیوں کو متشدد سمجھتے ہیں اور ان میں نرمی کے قائل ہیں۔ اس وسیع تحریک کے ان سب عناصر کو ابھی تک مسلمان، ایک ہی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور مکمل طور پر یکساں (homogeneous) سمجھ کر بلکہ ایک ہی منظم تحریک کا حصہ مان کر ان سے معاملہ کرتے رہے ہیں۔ یہ پہلے بھی صحیح نہیں تھا لیکن اب اس طرز عمل کا نقصان زیادہ شدید ہوگا۔ ان مختلف عناصر کے ساتھ مختلف معاملہ کرنا ہوگا اور ہر ایک کو اس کے موجود مقام سے نسبتاً زیادہ اعتدال کی طرف لانے کی کوشش کرنی ہوگی۔

☆ اس جائزے سے ہماری اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ اس تحریک کو محض ایک سیاسی تحریک سمجھنا انتہائی نقصان دہ ہے۔ اگرچہ قدیم برہمنی افکار اس تحریک کی فکری اساس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن اسے محض ذات پات کی لڑائی کی تحریک یا برہمن نسلی بالادستی کی تحریک سمجھنا بھی غلط ہے۔ یہ اصلاً ایک سماجی تحریک ہے اور اس کی گہری فلسفیانہ بنیادیں ہیں۔ ان بنیادوں پر سماج کے ایک طبقے کی ٹھوس ذہن سازی کے ذریعے انھوں نے موجودہ قوت حاصل کی ہے۔ صرف سیاسی میدان میں اس کا مقابلہ ناممکن ہے۔ وقتی طور پر ان کے مقابلے میں سیاسی فتح حاصل کر بھی لی جائے تو وہ ناپائیدار ہی ہوگی۔ اس تحریک کا طویل صبر آزما نظریاتی مقابلہ درکار ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان کی باتوں کو گہرائی سے سمجھا جائے۔ ان کے دلائل کا سنجیدہ جواب دیا جائے۔ جو لوگ ان سے متاثر ہیں ان سے مسلسل مکالمہ ہو۔ اوپر ان کے جو خیالات نقل کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام، اس کے معتقدات، اس کے تصورات اور اس کی تاریخ کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں اور اب یہی زاویے ملک کے عوام میں بھی عام کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس زاویہ نگاہ کی اصلاح کے لیے غلط معلومات، غلط فہمیوں، غلط تعبیرات وغیرہ کی گہری علمی مہم مطلوب ہے۔ ملک کے باقی عوام سے بھی مسلسل مذاکرات اور انگیجمنٹ درکار ہے تاکہ سنگھ کے ذریعے ان کی ذہن سازی ممکن نہ ہوسکے۔

☆ یہ مذاکرات اور مکالمے اسی وقت ممکن ہیں جب

ان کے فکری مزعومات کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔ان کے ذہن کو پڑھ کر، سمجھ کر ان کے سلسلے میں مناسب ڈسکورس تشکیل دیا جائے۔اس سلسلہ مضامین میں سنگھ کے بعض نمائندہ افکار کے سلسلے میں یہ کوشش ہم نے کی ہے لیکن اس کوشش کا دائرہ بڑھا کر سنگھ کے دائرے کے باہر موجود ان افکار کا بھی جائزہ ضروری ہے جو عوام کو متاثر کر رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس وقت جو نوجوان طبقہ دائیں بازو سے متاثر ہے وہ سیاسی طور پر بی جے پی کے ساتھ ہوسکتا ہے لیکن نظریاتی طور پر اس طبقے کا ایک قابل لحاظ حصہ وائس آف انڈیا جیسے افکار کا بھی اسیر ہے۔ یہ لوگ اپنے خیالات کے معاملے میں زیادہ صاف گو ہیں اس لیے ان سے بات کرنا بھی زیادہ آسان ہے۔ان سے انگیجمنٹ اس لیے بھی آسان ہے کہ اس کا کوئی فوری سیاسی یا سماجی ردعمل متوقع نہیں ہے۔

مسلمان توحید کے علم بردار بن کر اٹھیں

اس جائزے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مستقبل کی اصل کشمکش توحید اور شرک کے درمیان کشمکش ہے۔اس سے قبل کے جائزوں میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ نہ صرف آر ایس ایس کے مفکرین بلکہ بعض کانگریسی مفکرین بھی ادویت ویدانت کو ہندوستانی ورلڈ ویو کی اصل دھارا سمجھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں توحیدی افکار کو ہندوستانیت سے متصادم سمجھتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں جن افکار کا جائزہ لیا گیا وہ تو اعلانیہ اپنا مقصد ہی توحید کا رد اور شرک کا فروغ قرار دیتے ہیں۔ہم نے یہ بھی واضح کیا کہ اب بتدریج دنیا بھر کی شرک پسند قوتیں مجتمع ہو رہی ہیں اور گویا توحید کے خلاف نظریاتی محاذ پر صف آرا ہو رہی ہیں۔ان حالات میں توحید سے گہری وابستگی اور پوری وضاحت کے ساتھ توحید کے صاف وشفاف نظریے کو ملک کے سامنے پیش کرنا، یہی انبیائی کام، اہل اسلام کا اصل کام بن جاتا ہے۔

مسلمان اس اصل اور بنیادی کام کو چھوڑ کر جب محض اپنے بقا وتحفظ کی یا اپنے حقوق کی لڑائی کو کشمکش وجدوجہد کا اصل محاذ بنا لیتے ہیں تو خود کی کم زوری اور ستم پذیری (vulnerability) بڑھاتے ہیں، شرک کی دعوت کی مضبوطی کا سبب بنتے ہیں اور خود اپنے تحفظ وسلامتی کو اور زیادہ مخدوش بناتے ہیں۔کسی نظریاتی تحریک کے اثر کو نظریے کی سطح پر مقابلہ کر کے ہی کم زور کیا جاسکتا ہے۔اس لیے توحید کے اصول پر پوری استقامت اور اس صاف وشفاف عقیدے کی دل نشین دلائل کے ساتھ وضاحت، یہ اہل اسلام کا اس وقت سب سے اہم کام ہے۔

انتہا پسند افکار کا سب سے مؤثر آلہ کار غلط فہمیوں کا فروغ اور جھوٹ کا پروپیگنڈا ہوتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں بھی توحید کے تصور پر غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے بہت سے غبار چھائے ہوئے ہیں۔اوپر وائس آف انڈیا کی پوری بحث میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے خدا کو دیگر انسانوں کے خداؤں سے مختلف ایک ہستی بنا دیا ہے۔ قارئین کے لاشعور میں پہلے اسلام کی اس سادہ بات پر مغالطے کا دبیز پردہ ڈال دیا جاتا ہے کہ سارے انسانوں کا خدا ایک ہی ہے۔اس مغالطے کے نتیجے میں یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مستقل خدا ہے اور بس اسی خدا کو ماننے اور دوسروں کے خداؤں سے بغاوت کرنے کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ سیتا رام گویل نے ایک جگہ صاف صاف یہ غلط بات لکھی بھی ہے کہ ''قرآن مجید میں کہیں بھی اللہ نے تمام انسانوں کے خدا ہونے کا دعوی نہیں کیا ہے بلکہ صرف مسلمانوں کے خدا ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے''۔ یہ باتیں عام ہو کر مسلمانوں کے بارے میں اور ان کے عقائد کے بارے میں سوچ کا ایک خاص زاویہ تشکیل دے دیتی ہیں۔اس زاویہ کی اصلاح ہماری اصل ذمے داری ہے۔اس ملک میں توحید کے اثبات کے لیے ہمارا روایتی بیانیہ کافی نہیں ہے۔اس ملک کی سوچ اور یہاں کا مخصوص زاویہ نظر سمجھنا ضروری ہے۔مثلاً ہم شرک کے رد میں جن دلائل کا عام طور پر سہارا لیتے ہیں وہ یہاں اس لیے بے معنی ہو جاتے ہیں کہ اس ملک میں شرک کی فلسفیانہ اساس وجود کی وحدت کا نظریہ ہے۔ وہ خدا کو ایک مانتے بھی ہیں اور نہیں بھی مانتے۔اصلاً خالق اور مخلوق کو بھی ایک ہی وحدت کا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ان کے سامنے ویدوں اور پرانوں سے توحید کے حق میں دلائل لانا بھی بے معنی ہے۔'سب کا مالک ایک ہے' یہ تصور ان کے نزدیک لازماً کسی درخت یا ندی کی عبادت میں رکاوٹ نہیں ہے کیوں کہ وہ ہر چیز کو خدا ہی کے وجود کے حصے کے طور پر دیکھتے ہیں۔اس طرز فکر کے مقابلے میں عقیدہ توحید کا اثبات کچھ اور باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ ہمارے اہل علم کی ذمے داری ہے کہ وہ ان موضوعات کو زیر بحث لائیں۔(توفیق نصیب ہوئی تو آئندہ ہم بھی ان شاء اللہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کریں گے)

اس کام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی عقیدے اور اسلام کے پیغام اور اس کی اساسیات کو سیاسی وفرقہ وارانہ کشمکش کا موضوع نہ بنایا جائے اور مذہبی حمیت کو غیر ضروری طور پر مشتعل نہ کیا جائے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے داعیانہ کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک اہم بات یہ لکھی ہے کہ ''وہ اپنے کلام کو ہر اس چیز سے پاک رکھتے ہیں جو مخاطب کے اندر ضد اور مخالفت کا جذبہ پیدا کرے''۔''مخاطب کی غلط زندگی پر باانداز استخفاف تنقید'' کرنا، مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا، مناظرانہ انداز کلام، ان سب کو انھوں نے داعیانہ کلام کے منافی قرار دیا ہے۔کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیت جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے۔ملک کے موجودہ ماحول میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ دیوی دیوتاؤں کو یا مذہبی معتقدات کو مذاق کا اور کامیڈی کا موضوع بنانا یا لب ولہجے میں اہانت اور تمسخر کا انداز اختیار کرنا، ان باتوں سے سنجیدہ گفتگو اور افہام وتفہیم کی فضا متاثر ہوتی ہے اور مخاطبین اپنے افکار پر اور زیادہ ہٹ دھرمی کے ساتھ جمنے لگتے ہیں۔توحید کی حقیقت اور اسلام کے اصل پیغام کو سمجھنے کے لیے اس فضا کو ختم کرنا بھی ضروری ہے۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔اگست ۲۰۲۲ء)

بقیہ: مقبوضہ کشمیر: ثقافتی اور مذہبی شناخت خطرے میں!

'معمول' پر ہے اور اس سے اگست ۲۰۱۹ء کے اقدام کی حمایت ہو۔ تاہم اس منصوبے کو کشمیری رہنماؤں کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان رہنماؤں میں وہ بھارت نواز سیاستدان بھی شامل تھے جو ماضی میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لے چکے ہیں۔

کُل جماعتی حریت کانفرنس نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔سب نے ہی اس منصوبے کو ناقابلِ قبول قرار دیا اور یہ کہتے ہوئے مسترد کیا کہ یہ 'ایک فرد ایک ووٹ' کے اصول کے خلاف ہے۔ جولائی میں خطے کی آبادیات تبدیل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی اور مقبوضہ وادی میں موجود چیف الیکٹورل افسر نے ہر بھارتی شہری چاہے وہ عارضی طور پر ہی رہائش پذیر ہو کو کشمیر میں ووٹ ڈالنے کا حق دے دیا۔

کیا مودی حکومت اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہوسکتی ہے؟ کیا زور زبردستی اور انتظامی احکامات کے ذریعے کشمیر کی مسلم شناخت کو اتنی آسانی سے مسخ کیا جاسکتا ہے؟ درحقیقت ان اقدامات نے کشمیریوں کے غم وغصے میں مزید اضافہ کر دیا ہے اور ان کے جذبہ مزاحمت کو مزید توانا کر دیا ہے۔ جموں وکشمیر کے سابق وزیرِ اعلیٰ فاروق عبداللہ نے بہت پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ 'کشمیر کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ سکتا ہے'۔

"Assault on Kashmiri identity".
(Daily "Dawn" Karachi. October 3, 2022)

اقوامِ متحدہ میں اصلاحات کیوں اہم ہیں؟

Dr Ramzy Baroud

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ۷۷واں سیشن اس کے پچھلے ۷۶ سیشن اور دوسرے پرانے سیشن سے ملتا جلتا تھا، آسان لفظوں میں کہا جائے تو ایک ایسا اسٹیج جہاں سے خوبصورت بیانیے جاری ہوتے ہیں لیکن شاید ہی کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جاتا ہو۔

بدترین الفاظ میں کہا جائے تو یہ عالمی لیڈروں کے لیے محض ایک ذریعہ ہے جہاں سے وہ اپنے مخالفین کے لیے پوائنٹ اسکورنگ کرتے ہیں۔

یہ کسی کے لیے حیران کن نہیں ہونا چاہیے کہ بہت سالوں پہلے سے ہی اقوام متحدہ نے اپنے کرنے کے کام چھوڑ دیے ہیں، وہ طاقتور پالیسیاں بنانے میں اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے خوش مزاج لیڈر کا یا پھر سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر ایک منکسرالمزاج احتجاج کرنے والے کا کردار ادا کر رہا ہے۔افسوس کہ تیس سال پہلے عراق جنگ میں اقوام متحدہ کا جو کردار تھا یا روس یوکرین جنگ میں آج جو کردار ہے وہ اقوام متحدہ کی کمزور حالت کا ثبوت ہے۔اقوام متحدہ دنیا میں امن قائم رکھنے، مساوات اور عالمی تحفظ میں ناکام ہو چکی ہے یا عالمی معاملات پر بہت کم اثر رکھنے والی تنظیم ہے۔

جیسا کہ اکثر انتونیو گوتیرس جیسی آوازیں (جنہیں امن حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کی آوازیں کہا گیا) بڑے بڑے بندوق بردار اور معاشی پنڈتوں نے اپنے مفادات کے لیے یوکرین کی جنگ کو ایک لمبی طویل جنگ میں تبدیل کیا۔

بالکل گوتیرس کی طرح اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے موجودہ صدر کسابا کروسی بھی عملی شخصیت نہیں رکھتے، نہ ہی وہ اپنے عہدے سے متعلق کوئی اہم کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کروسی نے ۲۰ ستمبر کو سیشن کے آغاز میں خطاب کیا، انسانیت کی سب سے اہم ضرورت انسانیت کی پکار کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''ہم ساتھ کام کرتے ہیں، ہم جامع نیٹ ورک اور موثر کثیر الجہتی پر کام کرتے ہیں اور ان باتوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو ہمیں متحد رکھتی ہیں''۔

کروسی نے جو بات کی اس حوالے سے کم از کم ابھی اسے سوائے خوبصورت خواہشات کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقوام متحدہ کو جنگ کی آگ میں سے حل کا کنواں نکالنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر پر جون ۱۹۴۵ء میں دستخط ہوئے اقوام متحدہ کو دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں ابھرتی ہوئی نئی عالمی طاقت کے نمونے کی عکاسی کے لیے بنایا گیا، اقوام متحدہ کی عالمی تنظیمی ساخت نے دوسری جنگ عظیم کے فاتح ممالک کی تصدیق کی اور سکیورٹی کونسل کی مستقل رکنیت اور ویٹو پاور کے ذریعے ان ممالک کو مزید طاقتور بنایا جس کی وجہ سے وہ ممالک باقی دنیا سے زیادہ طاقتور رہے۔

یہ کوئی تاریخ سے انحراف نہیں ہے موجودہ اقوام متحدہ لیگ آف نیشنس کی پیش رو ہے جو کہ ۱۹۲۰ء میں بنائی گئی تھی، جو اُس کی جغرافیائی حقیقی حدوں کو یقینی بنانے کے لیے بنائی گئی تھی جس کے نتیجے میں جنگ عظیم اول پیش آئی۔

لیگ آف نیشن کو اس وقت ختم کر دیا گیا، جب اسے غیر مؤثر سمجھا گیا لیکن یہ سبب حقیقی نہیں ہے، حقیقت میں ایک پرانے تنظیمی ڈھانچے اور میک اپ جنگ عظیم دوئم میں بننے والی نئی عالمی طاقتوں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جہاں پرانے دشمن نئے دوست بن گئے تھے اور پرانے دوست نئے دشمن۔

اثر اندازی بہت چھوٹی سی ایک وجہ تھی جو لیگ آف نیشن کو یونائیٹڈ نیشن کی طرف لے گئی جیسا کہ بعد میں بھی دیکھا گیا کہ سنجیدہ سیاسی مسئلوں کو شاید ہی حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسے کہ کشمیر سے فلسطین تک، سوڈان سے مالی، افغانستان اور اس جیسی دوسری بہت سی جنگیں جس میں حالیہ یوکرین جنگ بھی شامل ہے۔

موسمیاتی تبدیلی میں اقوام متحدہ کے کردار پر زور وشور سے ہونے والی بحث بھی توجہ طلب ہے کیونکہ یہ پوری انسانیت کی بقا کا معاملہ ہے، یوکرین کی جنگ کا شکریہ کہ اس کے نتیجے میں پولرائزیشن پیدا ہوئی اور اپنے ملکی مفادات کے لیے اپنے طریقے سے سفارت کاری کی گئی۔ بہت سے ایسے ممالک جو ماحول دوست نظام کی طرف بڑھ رہے تھے وہ رک گئے ہیں۔

یقینی طور پر موسمی تغیرات کے مسائل ایک بار پھر بدترین پرانی حالت پر آ گئے اور یہ معاملہ بائیڈن کی طرف سے اس حد تک نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ اس مسئلے پر ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت نہیں کر رہے ہیں جو کہ ۲۱ ستمبر کو ہونا تھی۔

ایک سال پہلے اس مسئلے نے امریکا کے ماحولیاتی ماہرین کے درمیان ایک زبردست مباحثے اور غصے کو جنم دیا تھا لیکن اب یہ معاملہ ایک معمولی اور سیاسی طور پر غیر اہم مسئلہ ہے۔

لیکن ان تمام تضادات اور ناکامیوں کے برعکس کہ جب امن اور تحفظات کے وعدے پورے نہیں کیے گئے، اقوام متحدہ نے اپنی خدمات دی ہیں جو امریکا اور اس کے اتحادیوں کے لیے تھیں، سیاسی عالمی طاقتوں کے لیے اقوام متحدہ ایک اسٹیج کا کام کرتی رہی ان ممالک کو جنگ عظیم دوئم کی میراث سے یہ طاقت وراثت میں ملی ہے۔

تاہم چھوٹے ملکوں کے لیے (افریقا، مشرق وسطیٰ یا دنیا کا جنوب) اقوام متحدہ ایک آواز بنا ہے وہ آواز جو مشکل ہی سے سنی جانے کے قابل ہو یا کبھی کبھی ایسے مواقع فراہم کرنا۔ یہ مواقع بھی عارضی اور نا ملنے کے برابر ہی ہوتے ہیں دنیا کے جنوبی حصے کے ملکوں کے لیڈروں کی شعلہ بیانی، جذباتیت، حقائق پر مبنی تقریروں کے کبھی کوئی نتائج نظر نہیں آئے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نوآبادیاتی نظام، معاشی استحصال، نسل پرستی، فوجی یا سیاسی مداخلت کی حوصلہ شکنی کی گئی ہو۔

۲۰ ستمبر کو ایک کھلے خط میں عالمی رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے ۲۰۰ سے زیادہ عالمی انسانی تنظیموں جن میں OXFAM اور save the children بھی شامل ہیں نے یہ کہا کہ پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی بھوک سے ہر ۴ سیکنڈ میں ایک انسان موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

بڑھتی ہوئی بھوک سے پیدا ہونے والے المیے کا شکار سب سے زیادہ افریقا ہے، خوراک کی کمی جو کہ ایک بڑا مسئلہ ہے اس کے علاوہ بہت ساری علامات یہ بتاتی ہیں کہ بھوک کا غیر معمولی طوفان ابھی منڈلا رہا ہے۔ یہ ماحولیاتی تغیر سے شروع ہوا، کورونا ۲۰۱۹ء میں یہ بدترین ہوا، یوکرین جنگ اور راستے میں خلل کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہونے کا خدشہ موجود ہے۔

اقوام متحدہ کے بار بار اپیل کرنے کے باوجود کہ افریقا میں خوراک کی منتقلی کو ممکن بنایا جائے، ابھی تک کچھ نہیں کیا جا سکا، اس درخواست پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کے پاس بھوکے بچوں کے لیے خوراک کو محفوظ رکھنے کا اور انہیں زندگی کی بنیادی سہولیات دینے کی طاقت نہیں ہے تو پھر اس عالمی تنظیم کے مشن، اس کی تنظیمی ساخت اس کے وجود کے مقاصد کیا معنی رکھتے ہیں؟

////// باقی صفحہ نمبر ۸ \\\\\\

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کے زیر اہتمام

ربیع الاوّل ۱۴۴۴ھ سیرت النبی ﷺ کی مناسبت سے

مقابلہ مضمون نویسی

(اندرون ملک یا بیرون ملک) اسکول، کالج، یونیورسٹی یا عربی مدرسہ میں، کسی بھی مضمون اور کسی بھی جماعت میں زیر تعلیم طلبہ وطالبات اس مقابلے میں شرکت کے اہل ہیں۔

موضوعات

۱۔ اُسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینے میں ہماری زندگیاں۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مثالی مربی و رہنما۔

۳۔ امت مسلمہ کے لیے نجات کی راہ۔۔۔۔اسوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل۔

انعام مقابلہ میں شریک چھ بہترین مضمون نگاروں کو **دس، دس ہزار روپے نقد اور کتب** دیے جائیں گے۔

اسناد: تمام شرکا کو سند شرکت اور بہترین مضمون نگاروں کو سند توصیف بھی دیے جائیں گے۔

مقابلہ میں شرکت کے قواعد حسبِ ذیل ہوں گے:

- اپنا مضمون (معقول پوائنٹ سائز میں) کمپوز شدہ یا (ہاتھ اور قلم سے صاف اور واضح) تحریر کردہ صورت میں ارسال فرمائیے۔
- ایک فرد ایک ہی موضوع پر اپنی طبع زاد (Original) تحریر بھیج سکتا ہے۔ (A-4 سائز کے زیادہ سے زیادہ چھ صفحات)
- مضمون اردو، انگریزی، عربی زبان میں تحریر کیا جاسکتا ہے۔
- اگر آپ کسی کتاب سے کوئی اقتباس، یا کسی کے مضمون کا کوئی حصہ اپنی تحریر میں استعمال کریں تو حوالہ ضرور دیجیے۔
- مضمون مدلل، واضح اور درست اِملا (زبان وبیان) کے ساتھ تحریر کیجیے۔
- اوّل، دوم، سوم وغیرہ جیسی درجہ بندی نہیں کی جائے گی اور منصفین کا فیصلہ حتمی ہوگا۔
- مضمون کے ساتھ یہ کوائف بھی منسلک کیجیے: اپنا مکمل نام اور ولدیت، تاریخ پیدائش، ڈاک کا پتا، اگر برقی پتا ہو تو وہ بھی، رابطہ کے لیے موبائل نمبر، واٹس ایپ نمبر، موجودہ تعلیمی ادارے کا نام، کس شعبہ/مضمون اور کس جماعت میں زیر تعلیم ہیں؟
- شناختی کارڈ یا ب فارم کی کاپی بھی منسلک کیجیے۔
- مضمون نیچے درج پتے پر ڈاک سے، یا ای میل کے ذریعے **31 اکتوبر 2022ء** بروز پیر تک پہنچ جانا چاہیے۔

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

ڈی۔35، بلاک۔5، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔75950، پاکستان ویب سائٹ: www.irak.pk

برائے رابطہ: فون: 36349840(92-21)، 0331-2859032، ای میل: irak.pk@gmail.com

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950